Fikr-o-Nasar (Islamabad) 45:1 (2007)

فقہ التحیّز *

تصنیف: عبدالوہاب المسیری**	ترجمہ: عمر فاروق***

ضروری گذارش:

ترجمہ شدہ مقالہ اپنی نوعیت کے ایک اہم فکری موضوع سے متعلق ہے۔ یہ مصری مصنف عبد الوہاب المسیری کی مرتبہ دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب بعنوان: (إشکالیة التحیُّز) کے پہلے تفصیلی مقالے کا ترجمہ ہے۔ کتاب (فقہ التحیُّز) کے موضوع پر منعقدہ ایک سیمینار کی روداد اور اس میں پیش کردہ مقالات پر مشتمل ہے، جو International Institute of Islamic Thought (IIIT) نے ۱۹۹۶ء میں امریکہ سے شائع کی۔ مقالے کے عنوان میں اگرچہ 'فقہ' کا لفظ شامل ہے، لیکن وہ اپنے اصل معنوں کے علاوہ مصنف کی جانب سے (گو ایک نئے مگر) اصیل شعبۂ علم کے ممکنہ آغاز پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم مترجم کی رائے میں یہ مشرق کی مسلسل مغربی استحصال کے خلاف علمی سطح پر اٹھائی گئی آواز ہے، جسے ہم Plight of Modern Western Man کے مقابل Plight of Contemporary Eastern Man کا نام دے سکتے ہیں۔

مصنف کا اس مقالے میں پیش کردہ بنیادی خیال (thesis) یہ ہے کہ دنیا میں 'تحیُّز' یا جانبداری کے بغیر کوئی بات ممکن نہیں۔ یہی انسان کا حقیقی مقسوم اور اس کی اصل حیثیت و منصب ہے۔ لہٰذا مرعوب ہو کر یا آلۂ کار بن کر دوسرے کی بات اپنانے کی بجائے اپنے من میں جھانک کر دیکھا جائے، اپنی فکری و عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے اور اپنے نظریات و اقدار کو بیک قلم، بے سوچے سمجھے یا جان بوجھ کر، ترک کرنے والے رویے پر نظرِ ثانی کی جائے۔ مصنف نے تاریخ، فلسفے، سماجی علوم، نیز روزمرہ کی زندگی اور سیاسی حالات سے استمداد کرتے ہوئے پہلے مغربی تہذیبی نظام (pattern) کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور اس کے پیچھے کارفرما فکری عناصر کو نمایاں

---

* یہ ایک طویل مقالہ ہے، جسے تین اقساط میں پیش کیا جائے گا، پہلی قسط نذرِ قارئین ہے۔

** عبدالوہاب المسیری مصر سے تعلق رکھتے ہیں، بنیادی طور پر انگریزی اور تقابلی ادب اُن کا موضوع رہا اور اسی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اہرام فاؤنڈیشن مصر میں بطور ماہر صہیونی امور کام کیا اور پھر صہیونی یہودی افکار اُن کے تجزیاتی مطالعہ جات کا خاص موضوع بن گئے۔ عربی اور انگریزی میں اُن کی بہت سی تصانیف شائع ہو چکی ہیں، بہت سے تحقیقی مقالہ جات بھی علمی مجلّات کی زینت ہیں، اُن کا ایک اہم مقالہ "العلمانیة: رؤیة معرفیة" ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے عربی مجلّہ "الدراسات الاسلامیة"، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۴ء شمارہ: ۴، میں شائع ہوا۔ مسیری بقید حیات ہیں مگر سرطان کے موذی مرض کا شکار ہیں۔

*** ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

DMHL

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

کیا ہے۔ پھر مغربی پیٹرن کے مقابل میں، بطور متبادل، مشرق کے تہذیبی نظام کی بازیافت اور تشکیلِ نو کی کوشش کرتے ہوئے ہمارے فکر و عمل کو مہمیز دی ہے۔ مغرب سے اخذ و استفادہ کو مصنف نے شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیا۔ ہاں، اپنے سماجی و جغرافیائی حالات، نیز اپنی اصالت (originality) کی حامل اقدار کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت اجاگر کی ہے۔ قاری اگر یکسوئی کے ساتھ اس مقالے کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرے تو مصنف کا اس میں پیش کردہ بنیادی خیال اور اس پر مبنی نظامِ فکر سمجھنے میں سہولت ہو گی۔ ورنہ، باوجود اس وضاحت کے، مختلف آراء اور نظریات کے سلسلے میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

یہاں مترجم کی طرف سے خاطر نشاں رہے کہ لازم نہیں وہ مصنف کی ہر بات اور رائے سے متفق ہو۔ ترجمہ انجام دینے اور منظرِ عام پر لانے کی اصل وجہ موضوع کی اہمیت ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مترجم کو بعض حلقوں سے گلہ ہے کہ وہ اس کی ہر دیکھی، سنی، کہی، لکھی، حتی کہ محض ذہن میں موجود کوئی سوچی بات بڑے 'اذعان و یقین' کے ساتھ اس پر لاگو کرنا، نیز معمول کی کسی بھی بات کی متوازی یا معکوس انداز میں نقل اتارنا شروع کر دیتے ہیں۔ کم سے کم پچھلے سات سال کے عرصہ سے وہ یہ عذاب بھگتتا چلا آ رہا ہے۔ اس قسم کے نام نہاد 'آشوبِ آگہی' یا (بعض کے نزدیک) 'روحانی باطنی نظام' سے وہ یہاں واضح الفاظ میں براء ت کا اظہار کرتا ہے۔

مصنف کے پیرایۂ بیان اور اسے اردو میں منتقل کرنے کے حوالے سے ذیل کی معروضات ضرور پیشِ نظر رہیں:

۱۔ ترجمے میں کچھ مطالب کی تکرار کو اسی طرح رہنے دیا کہ ایک تو موضوع نیا اور دقیق مباحث کا حامل ہے، دوسرے دہرائی گئی بات عام طور پر چند صفحات کے بعد جا کر آتی ہے۔

۲۔ (تحیُّز) کا ترجمہ جانبداری اور کہیں میلان یا تعصب کیا ہے، تاہم مفہوم واضح ہو جانے پر اور بطور اصطلاح اکثر 'تحیُّز' کا لفظ ہی استعمال کیا۔

۳۔ (پیٹرن) کا انگریزی لفظ، عربی لفظ (نموذج) کے ترجمے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سیاق کے اعتبار سے یہ لفظ (نظام/ نظامِ کار/ نظامِ فکر/ سانچے اور ماڈل) کے معنوں میں زیادہ استعمال ہوا ہے، اور کئی جگہ اس کا ترجمہ یہی کیا۔

۴۔ (ظاہرۃ) کے عربی لفظ کا ترجمہ دو لفظوں (مظہر و حال) سے، بلکہ زیادہ تر جمع کے صیغے میں (مظاہر و احوال) کیا ہے۔ (الواحدیۃ المادیۃ) کو سیاق کے اعتبار سے (ایک اور یکساں نوعیت والا پیٹرن) لکھا ہے۔

۵۔ تحقیق کار، تحقیق پرداز اور محقق کے ہم معنی الفاظ کا استعمال جملے کے در و بست میں اسلوب کے لحاظ سے کیا، ورنہ مترجم کے پاس محقق کے رائج لفظ کو بدلنے کی کوئی اور وجہ نہیں۔ البتہ کلی، کلیہ جاتی اور کلیاتی کے اصطلاحی

الفاظ بعض جگہوں پر معنوی تغیر کے ساتھ استعمال ہوئے۔

۶۔ بعض خالص عربی مفاہیم کو ہلکی سی تبدیلی کے ساتھ اپنے ماحول کا تناظر دینے کی کوشش کی ہے۔ البتہ جہاں یہ ممکن نہ ہوا، وہاں بجائے حذف کے اصل کو بعینہٖ برقرار رکھا کہ اس سے موضوع کو آگے بڑھانے اور تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

۷۔ اس کے علاوہ رواروی میں اگر، مثال کے طور پر، خالص ادبی تنقید کا حامل کوئی پیراگراف ترجمے میں شامل کر لیا تو اسے نشان زد کر دیا ہے۔ کچھ انتہائی طنزیہ لیکن دلچسپ انداز کے حامل پیراگراف بھی مصنف کی شوخی اور اپج کو دیکھتے ہوئے برقرار رکھے، جیسے کرسی اور گھریلو استعمال کی بعض چیزوں پر اس کا خندہ آور بیان۔

۸۔ بعض عنوانات کو تفہیم کی خاطر ذرا سا تبدیل کیا ہے۔

۹۔ ترجمے میں کہیں ادبی یا عام فکری نوعیت کا مضمون ادا کرتے وقت تھوڑا سا طبع زاد انداز اپنایا گیا ہے۔ موقع کی مناسبت اور اسلوب یا لفظی تراکیب کے حوالے سے، نیز مصنف کے زورِ بیان کو ظاہر کرنے کی خاطر بعض مقامات پر سیاق اور اسلوب کو مدِّنظر رکھتے ہوئے متن یا پھر حاشیے میں برمحل مصرعے اور اشعار بھی درج کر دیے۔ اس لحاظ سے ترجمے کے کئی مقامات پر ذیل کے الفاظ منطبق آتے ہیں:

"I did not translate .. as an interpreter, but as an orator ... not ... word for word (verbum pro verbo), but I preserved the general style and force of the language." (Cicero)

۱۰۔ اس ذرا سے طبع زاد انداز، اور کہیں مفہوم کو گرفت میں لا کر اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی وجہ سے بڑی قوسین [ ] کا استعمال بہت کم ہوا۔ متن میں اس نوعیت کے معمولی اضافے یا تبدیلی کو قاری خود محسوس کر سکتا ہے۔ حواشی کے آخر میں بھی مترجم کا لفظ ضرورت کے وقت ہی لکھا ہے۔

۱۱۔ اکہرے واوین ' ' کو الفاظ اور تراکیب کی تلمیحی صفت، ماخوذ ہونے یا کبھی ان کی معنوی اور خاص ترکیبی یا اصطلاحی جہت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے، اور چھوٹی قوسین ( ) کا استعمال بعض اوقات کسی اصطلاح یا لفظ اور ترکیب کے نمایاں (highlight) کرنے کی خاطر بھی ہوا۔

۱۲۔ ترجمے کی زبان ممکنہ حد تک قابلِ فہم رکھنے کی کوشش کی ہے، تاہم فلسفیانہ نوعیت کے مضامین کی ادائیگی میں اسلوب کا سادہ رکھنا مشکل تھا۔ علاوہ بریں، کچھ مقامات پر عربی متن کا لہجہ تلخی کا حامل ہے، جو ترجمے میں اصل کے مطابق رہنے دیا۔ (مترجم)

دعوتِ فکر و اجتہاد

جانبداری (تحیُّز) اور منہج کے اختیار کا مسئلہ

منہج اور اصطلاحات کے تعین و اختیار میں تحیُّز (جانبداری) کا سوال وہ بنیادی مسئلہ ہے جو مشرق و مغرب، شمال و جنوب، دنیا کے ہر ہر کونے میں آباد تحقیق پرداز کے لیے ایک لا ینحل معمّہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم تیسری دنیا میں یہ مسئلہ کچھ زیادہ شدت اختیار کیے ہوئے ہے۔ تیسری دنیا کا پڑھا لکھا باشندہ ایک ایسے تہذیبی، ثقافتی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے جس کی دانش و تمدن کے اپنے خاص سانچے یا پیٹرن ہوتے ہیں، لیکن وہ یہ دیکھتا ہے کہ کچھ دیگر مختلف نوعیت کے پیٹرن اس کے احساس و وجدان اور فکر و فہم پر انفرادی و اجتماعی ہر لحاظ سے غلبہ پانے کی مسلسل کوشش میں ہیں۔ یہ عمل اٹھارویں صدی کے اواخر میں اس وقت شروع ہوا جب مغربی استعمار نے بتدریج اپنے پر پھیلائے اور مشرق پر دندانِ حرص و آز تیز کیے۔ اس عمل کے دوران مغرب کے تہذیبی وعلمی سانچے انتشار کا شکار مشرقی تہذیب میں متبادل کے طور پر پیش کیے جانے لگے۔ یوں باقاعدہ ایک ثقافتی جنگ کا آغاز ہوا جو استعمار سے نجات پاکر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے والے مشرقی ممالک___ جنھیں پہلے 'سرد جنگ' کی چکی میں خوب پیسا گیا___ کے خلاف علمی طور پر 'تہذیبوں کے تصادم' اور سیاست کی بساط پر یہ کشمکش پھر سے واقعی جنگ کی صورت میں نمایاں ہو کر سامنے آئی، اور دنیا کو 'یک قطبی جدید عالمی نظام' نے آگھیرا۔ مغربی تہذیب کے مختلف سانچے مغرب کی سیاسی و اقتصادی ترقی کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوئے، لیکن سماجی، نفسیاتی اور انسانی حوالوں سے تاریک اور تباہ کن پہلوؤں کے حامل ہیں۔ پھر یہ سانچے ضروری نہیں کہ غیر مغربی اقوام (جو دنیا کا غالب حصہ ہیں) کے لیے بھی مفید ثابت ہوں اور ان کے سماجی و جغرافیائی حالات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشروں میں مغرب کا یہ فکری پیٹرن اور اس سے متبادر نظام ہائے کار، حالات میں بہتری کی کوئی صورت پیدا کرنے اور واقعی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں بیشتر ناکام رہے، اور قومی سطح پر انھیں اپنانے اور نافذ کرنے کی بار بار کی جانے والی کوششیں عام طور پر نقصان دہ ثابت ہوئیں۔

ہر معاشرے کے اپنے تعصّبات اور جانبداریاں یا تحیُّزات ہوتے ہیں، لیکن بیشتر غیر مغربی اقوام نے اپنی تاریخی روایات، ماحول اور تہذیبی و انسانی اقدار سے دست بردار ہو کر دوسرے کے، یعنی مغرب کے تحیُّزات اختیار کرتے ہوئے اسی کے نقطۂ نظر اور معیارات کے حوالے سے اپنی اقدار

و روایات کو پرکھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ تحیُّزات اور معیار زیادہ تر ہمارے معاشروں کے خلاف تھے۔

تحیُّز کا یہ مسئلہ بہت سے لوگوں نے پیش کیا اور اس پر خوب مباحثے بھی ہوتے رہے۔ پھر ہمارے ہاں جب قومیت کی لہر اٹھی تو یہ سوال سامنے آیا کہ اپنی شناخت اور تہذیبی خاصیتوں کو کیونکر برقرار رکھا جائے۔ تاہم اس سارے قضیے کا ایک مربوط نظامِ فکر کے تحت مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے موجودہ دور میں کسی نئے علم کی بنیاد نہیں رکھی۔ ہر چیز، ہر سوچ اب مغرب سے در آمد کی جاتی ہے۔ مغرب والے نئی نئی سائنسی ایجادات کرتے ہیں اور ہم پہلے دانتوں میں انگلی دبا کر حیران ہوتے ہیں، پھر تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند کرتے اس جنسِ گراں کے خریدار بننے اور اسے اپنانے کے دل و جان سے خواہاں ہو جاتے ہیں، خواہ ان ایجادات کے استعمال سے واقف اور ان کے نقصانات و فوائد پر مطلع ہوں یا نہیں۔ اسی طرح وہاں نئی نئی فکری بدعات بھی جنم لیتی ہیں اور ہم ہر سوچ میں اہلِ مغرب کا کامل اتباع کرتے، ان کی ہر بات طوطے کی طرح دہراتے ہیں۔ اگر وہ ''ترقیاتی نفسیات'' کی بھیرویں گائیں تو ہم ان کے پیچھے اسی طرح ''ترقیاتی نفسیات'' کی ہانک لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اگر ''صنعتی نفسیات'' کا راگ الاپیں گے تو ہم بھی ''صنعتی نفسیات'' کی قوالی گائیں گے۔ اگر وہ ''ردِتشکیلی نفسیات'' کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیں تو ہم بھی فوراً (یا شاید ذرا دیر سے) ''ردِ تشکیلی نفسیات'' کی رٹ لگائیں گے۔ یعنی ان کی ہر بات ہمارے ہاں 'مکرر کہے بغیر' نہیں رہتی۔ علم و فن کی جو شاخ بھی وہ نکالیں ہم 'ہزار داستان' بن کر اس کے پھولوں میں بسیرا کر لیتے ہیں، جو عین ممکن ہے کانٹوں نے 'بطور پھندا' پھیلا رکھے ہوں۔ لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ آیا خود ہم نے علم کا کوئی نیا شعبہ، کوئی نئی جہت دریافت کی ہے جو ہمارے واقعی درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد دے سکے، تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جدید مسلم تہذیب و تاریخ میں ایسا 'حادثہ' پیش نہیں آیا۔

اس صورتِ حال میں مَیں نے یہ محسوس کیا کہ ہمیں کہیں سے تو آغاز کرنا چاہیے۔

سفر کہیں سے تو آغاز کرنا پڑتا ہے
جو ابتدا ہی نہیں ہے تو انتہا بھی نہیں(۱)

بہت سوچ بچار اور بحث و تمحیص کے بعد میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک ایسے علم کی داغ بیل ڈالی جائے جس کا اپنا ایک مربوط نظامِ فکر ہو، ایک طریقۂ عمل اور حوالۂ استناد ہو، جو اس تحیُّز (جانبداری) کے باب میں ہماری رہنمائی کا کام انجام دے اور اس حوالے سے سوچ فہم کے تاریک خانوں کو منور کرتے ہوئے اجتہاد کا در وا کر سکے، تاکہ ہم روشن دن کے اندر کھلی آنکھوں سے

دیکھنے کے قابل ہوسکیں۔ شپرّہ چشمی اب بہت ہو چکی۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات کا گہرا احساس رکھتا ہے کہ قومی سطح پر ہو یا دینی و ملی حوالے سے، امتِ مسلمہ کی شناخت مغربی تہذیبی سانچوں اور نقطہ ہائے نظر اپنانے کے باعث نہ صرف یہ کہ بری طرح مجروح ہوئی، بلکہ زائل ہو جانے کا خطرہ درپیش ہے، بالخصوص 'مطلعِ غربیؔ' پر سے سیاہ بادل نکل کر یوں چھا جانے کے بعد کہ صاف آسمان نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اندھیرے اجالے کی تمیز مٹ چکی ہے۔

ہمارے بیشتر اہلِ علم اور محققین اس بات کا گہرا احساس رکھتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے ہاں جو انسانی علوم پائے جاتے ہیں، ان میں اختیار کیے گئے مناہج اور طریقہ ہائے فہم وعمل یقیناً غیر جانبدار نہیں ہیں۔ وہ اقدار کے اس مجموعے یا نظام کی نمائندگی کرتے ہیں جو تحقیق کے نقطۂ نظر اور طریقۂ کار کو نہ صرف مخصوص طور پر متعین کرتا ہے، بلکہ بہت سے نتائج بھی پہلے سے طے کر دیتا ہے۔ اسی پر اصطلاح میں (تحیُّز)، یعنی جانبداری کا اطلاق کیا گیا ہے۔ (تحیُّز) ایسی اقدار کے مجموعے کا نام ہے جو تحقیق کے مناہج و ذرائع اور خود علمی پیٹرن کی ساخت میں پنہاں ہوتی ہیں، اور جنھیں تحقیق کار شعوری سطح پر محسوس کیے بغیر اپنی تحقیق میں اپناتا ہے۔ اگر وہ ان کا ادراک بھی رکھتا ہو تو بھی یہ اقدار مناہجِ تحقیق سے اس حد تک الجھی گتھی ہوتی ہیں کہ ان سے انحراف کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

یہ اقدار پوشیدہ علمی سانچوں اور استعاروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ عام طور پر جب ہم ارتقاء کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد اس علامتی یا استعاراتی اندازِ فکر سے ہوتی ہے جس میں انسانی تاریخ خطِ مستقیم پر سفر کرتی ایک معین مقام تک پہنچتی ہے۔ ہم یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کبھی اور کہیں تاریخ کا سفر دائروں کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ پھر اس میں ہماری سوچ کمیّتی انداز کی حامل ہوتی ہے کہ جیسے اشیاء ایک دوسرے کے اوپر بیٹھتی جاتی ہوں اور ادھر ادھر بکھرتی گرتی ہوں نہ وہ الگ سے اپنی خصوصیات رکھتی ہوں۔ نیز قدیم اور جدید کے حوالے سے ہم پہلے سے اقداری نوعیت کے احکام صادر کر دیتے ہیں کہ پچھلی چیز لازمی طور پر کم تر اور منفی ہے، جبکہ نئی بات مثبت اور اعلیٰ۔ احوال و قرائن کا علم حاصل کیے بغیر، تبدیلی و تغیر کو ہم حقیقتِ مطلقہ کی حیثیت دے دیتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ 'سیّار' کے ساتھ کچھ 'ثوابت' بھی ہوا کرتے ہیں جن کی ظاہری شکل و صورت تو بدل سکتی ہے، لیکن اصل خد و خال اپنی حالت برقرار رکھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم ترقی کی بات کریں تو اس سے ہمارا قصد ایک ایسا نامیاتی یا نیم نامیاتی استعارہ ہوتا ہے جس کے تحت سب عناصر اس طرح ہم آمیز و ہم آہنگ ہیں کہ جیسے واقعتاً وہ ایک جسم کے باہم دگر پیوست متناسب و متجانس اعضا ہوں، اور ایک

عنصر میں تغیر و تبدل باقی سب یا بیشتر عناصر میں تبدیلی کا متقاضی ہو۔ اگر ہم یہودیوں کی تاریخ کا قصہ چھیڑیں تو اس میں پوشیدہ استعارے کے تحت سارے یہودی گروہ اپنی خاص سرگرمیوں کے لحاظ سے ایک ایسی علیٰحدہ اور مستقل تنظیمی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں جو انھیں اپنے اپنے معاشرے کی مختلف النوع سرگرمیوں سے الگ کریں۔ یہ بات ہمارے پیشِ نظر نہیں رہتی کہ ان گروہوں کے آپس کے داخلی تضادات اور اختلافات کیا ہیں۔ ان استعاروں اور علامتوں کے ظاہری طور پر اپنانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سے منسلک آراء و افکار سب کی سب اور جوں کی توں اختیار کر لی جائیں، بلکہ تحقیق کار اور ان افکار کے درمیان ایک طرح کا اختیاری ربط اور ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے جس میں یہ نظریات و افکار پنپ سکیں۔ چنانچہ تحقیق کار کو لازمی طور پر بعض ایسے نظریات اور ان سے متعلق مختلف عناصر و احوال کے لیے متحیّز (جانبدار) ہونا پڑتا ہے جو ان استعاروں سے منسلک اور ان کے پروردہ ہوں، اور جن سے ہٹ کر دیگر علامتی پیٹرن اور ان سے متبادر احوال و افکار پھر اس کے لیے (شعوری یا غیر شعوری سطح پر) پرِ کاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ فکر و فہم میں پوشیدہ یہ تمام استعارے اور علمی سانچے ہمیں مغرب سے بنے بنائے ملتے ہیں اور یقیناً صحت و غیر جانبداری کی صفات سے متصف نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا تحقیق پرداز نہ صرف یہ کہ حریتِ فکر سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اپنے کسی تہذیبی پیٹرن اور نقطۂ نظر کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت بھی اس سے سلب ہو جاتی ہے۔ یوں وہ خواہی نخواہی دوسرے کے جانبدار افکار اپنا لیتا ہے جو غیر محسوس انداز سے اس کی سوچ فہم پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے انفرادی محسوسات و اجتہادات کو واضح اور متعین انداز سے سب پر ظاہر کر دیں، اور انھیں یوں مرتب و مربوط شکل میں سامنے لائیں کہ مناہج کے تعین میں تحیُّز (جانبداری و تعصب) کے اس مسئلے کو حل کرنے میں وہ ہماری مدد کر سکیں۔ ہمیں پتا چلے کہ تحیُّز کی خصوصیات اور طریقۂ عمل کیا ہے؟ یہ مضر ہے یا مفید؟ نقصان دہ ہے تو آیا اس سے بچنا ممکن ہے؟ اور فائدہ مند ہے تو کیونکر؟ اس طرح علم و دانش کا ایک ایسا متبادل پیٹرن سامنے آ سکے جو ہمارے ذہنوں پر ہوّا بن کر سوار ہو جانے والے (تحیُّز) کے اسطورے کو تحلیل کر دے۔

تحیُّز (جانبداری) کیا بلا ہے؟

انسانی زندگی اعمال و افعال، سلوک اور میل جول، الفاظ و حرکات، حوادث و سوانح اور ان جیسی دیگر بے حساب و شمار حیاتی سرگرمیوں سے عبارت ہے، اور عملِ تنفس جیسے کچھ اضطراری و طبعی افعال کو

چھوڑ کر باقی ہر بات کا کوئی نہ کوئی ارادی مفہوم ہے اور وہ شعوری یا غیر شعوری مگر ایک سوچے سمجھے اختیاری عمل کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کے تحت کچھ اقدار کا ایک خاص مجموعہ اپنا لیا جاتا ہے اور دوسرے کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ آیئے اس سلسلے میں پہلے چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

چند مثالیں

دنیا میں کچھ تہذیبیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن میں لوگ دو یا تین رنگوں کے علاوہ کسی رنگ کو نہیں جانتے۔ اسی طرح کچھ تہذیبیں ایسی بھی ہیں جن میں افراد الگ الگ اپنی 'ذات' کو نہیں پہچانتے۔ اگر آپ ان میں سے کسی کو اپنی آپ بیتی سنانے کا کہیں تو وہ عام طور سے اپنے دادا پردادا کی سوانح کے منقول واقعات ہی بتا سکے گا۔ پھر کچھ ایسی زبانیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں جو سبب سے مسبب پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ جب ایک اسکیمو بچہ کہتا ہے: (وہ دیکھو برف!)، تو مخاطب کو معلوم ہونا چاہیے کہ 'برف' کا مفہوم اس کی زبان میں کوئی پچاس غیر مترادف الفاظ سے ادا ہوتا ہے اور ہر لفظ برف کی کسی خاص شکل اور حالت کو بیان کرتا ہے، (بالکل ویسے ہی جیسے زمانۂ جاہلیت اور ظہورِ اسلام کے بعد تک بول چال کی مستعمل عربی زبان میں اونٹ، تلوار، گھوڑے وغیرہ کے لیے سینکڑوں مترادف الفاظ لغت کی کتابوں میں درج ملتے ہیں، جو درحقیقت ان کی مختلف حالتوں یا صفات کو بیان کرتے ہیں)۔

برف کا طوفان اٹھا اور ایک اسکیمو قبیلہ اس کی زد میں آ کر تتر بتر ہو گیا۔ طوفان تھما اور قبیلے کے افراد اکٹھے ہوئے تو ایک عورت کم تھی۔ تلاشِ بسیار کے باوجود وہ نہیں ملی۔ معلوم نہیں تند و تیز طوفانی ہوا کے تھپیڑوں میں کہیں دور جا نکلی یا برف تلے دب کر رہ گئی۔ قبیلے والوں نے اپنے معمول کے مطابق ایک سے دوسری مناسب جگہ کے لیے منتقلی کا سفر جاری رکھا، اور اس عورت کو بھول گئے۔ کوئی سال بھر کے بعد وہی کھو جانے والی عورت انھیں ایک جگہ اکیلی اپنے کپڑے بنتی ہوئی ملی۔ اگرچہ وہ سخت نا مساعد حالات اور انتہائی درشت موسم میں گھری ہوئی تھی، لیکن اس نے اپنے کپڑوں میں تزئین و آرائش کے لیے اسکیمو والے خاص نقش و نگار بنانا ترک نہیں کیے۔ یعنی ابتدائی انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی اس خاتون کے نزدیک جبلی طور پر خوبصورتی انسانی وجود کے لیے لازمی اور بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی تھی، ورنہ کپڑے بنتے ہوئے وہ کیوں ان میں خاص طرز کے زیبائشی نقش بناتی، جبکہ اسے اپنی مادی و جسمانی بقاء کے لیے فقط ایک گرم لباس کی فوری ضرورت تھی۔ شاید کوئی افادی (pragmatic) سوچ کا حامل شخص کہے کہ وہ عورت 'پس ماندہ اور تقلیدی' ذہن کی حامل تھی، خواہ

مخواہ اپنا وقت ایک ایسے کام میں ضائع کیا جو اس کے لیے کسی فائدے کا حامل نہ تھا۔

میرا ایک دوست کچھ سال دور دراز کے ایک افریقی گاؤں میں کسی غرض سے مقیم رہا۔ وہاں ایک دن اس کے چار افریقی دوست اس کے پاس آئے اور بغیر کچھ بولے خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ منٹ اسی طرح گزر گئے تو میرا دوست بے چینی محسوس کرنے لگا اور ان سے آمد کا سبب دریافت کیا۔ جس پر وہ گویا ہوئے کہ ہم فقط کچھ دیر تمھارے پاس بیٹھنے کو آئے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں 'خاموشی کی فصاحت' بعض موقعوں پر 'الفاظ کی بلاغت' سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ (میرا دوست ان افریقیوں سے خاموشی کا یہ مطلب جان کر پہلے سے زیادہ سمجھ دار ہو گیا)۔

ایک بار مَیں اس ملعون دیوار کے پاس کھڑا تھا جو رفح کے مصری قصبے کو اس کے فلسطینی حصے سے جدا کرتی ہے۔ مقبوضہ حصے میں نقل و حرکت پر پابندی تھی اور ہر چیز پر قبرستان کی سی گھمبیر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ تین بکتر بند اسرائیلی گاڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہولے ہولے رینگتی جا رہی تھیں، اور ان کے پاس سے ایک بڑی عالیشان گاڑی تقریباً ہر پندرہ منٹ بعد تیزی سے چکر کاٹ کر نکل جاتی۔ وہاں اس کے علاوہ اور کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ قاہرہ سے میرے ساتھ آئے ایک تیز طرار نوجوان صحافی نے وضاحت کی کہ اسرائیل کی یہ بکتر بند گاڑیاں بڑے 'ڈسپلن' اور ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی ہیں، اور ان پر مقرر نگران بڑی فرض شناسی سے اپنی 'ڈیوٹی' ادا کرتے ہوئے جا رہا ہے۔ ہمارے قریب ہی دیوار میں بنے راستے پر متعین مصری فوج کا ایک سپاہی کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے صحافی کی اس وضاحت پر قہقہہ لگایا اور بولا: بکتر بند گاڑیاں اس لیے ایک دوسرے سے جڑ کر چل رہی ہیں کہ پابندی کے باوجود اسرائیلی سپاہی مسلسل خوف کی حالت میں ہیں کہ کہیں کوئی فلسطینی ان پر حملہ نہ کر دے، اور ان کا نگران اس بلا کی تیزی سے اس لیے گزر رہا ہے کہ وہ ان سے بڑھ کر خوف کا شکار ہے۔ پھر اس نے ہمیں اہلِ رفح کے کارنامے سنائے کہ کس ہمت سے وہ اسرائیلیوں کی مزاحمت کر رہے ہیںاور کس طرح آپس میں اتحاد و تعاون کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نیز کیسے وہ پیغامات، کھانے پینے کا سامان اور معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ کرفیو کے دوران اگر کسی گھر میں آٹے کی ضرورت ہو تو پتھر پر لپٹا کاغذ کا ایک ٹکڑا ایک سے دوسرے اور وہاں سے تیسرے گھر اڑتا ہوا جائے گا، اور جس کے پاس آٹا زائد مقدار میں ہوا، وہ اسے ایک تھیلی میں ڈالے گا جو اسی طرح اڑتی ہوئی واپس ساتھ والے گھر میں اور وہاں سے ضرورت مند کے پاس پہنچ جائے گی۔ پھر سپاہی نے کہا: گزر گاہ پر یہ گیٹ صلاح الدین ایوبی کے نام سے موسوم ہے۔ وہ بیت المقدس، فلسطین اور دوسری اسلامی ریاستیں وا گزار کرانے یہاں سے گزرا تھا۔ غور کیجیے کہ ایک داخلی شکست

کے احساس نے تمام خارجی اشیاء اور واقعات کو ہزیمت کا نمائندہ بنا کر رکھ دیا تھا، اور ایک داخلی فتح کے شعور نے انھی چیزوں کو عزت و سر بلندی بخشی ہوئی تھی۔ عز و شرف کے احساس اور نکبت و ذلت کی حالت کے مابین کتنا فرق تھا۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا تا بکجاست!

جب میں کنگ سعود یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں تدریس پر مامور تھا تو شعبے کے ایک استاد نے اپنے درجہ و منصب کی ترقی کے لیے کچھ تحقیقی مضامین تعلیمی کمیٹی کے سامنے پیش کیے، جن میں سے بیشتر امریکہ کے صہیونی یہودی ادیبوں کے لکھے ناولوں میں عربوں کی پیشکش کے مطالعے پر مبنی تھے۔ یونیورسٹی نے بتقاضائے علمیت، جانچ اور محاکمہ کے لیے یہ مضامین عرب اور غیر عرب ماہر اساتذہ کو ارسال کیے۔ ان میں ایک امریکی پروفیسر کا جواب ہمارے لیے حد درجہ حیران کن تھا۔ اس نے تمام مضامین اسی طرح واپس بھیج دیے، اور اپنے منسلکہ خط میں لکھا کہ 'صہیونیت' فقط ایک کھوکھلا لفظ (buzz word) ہے، جو بولنے میں آواز تو پیدا کرتا ہے لیکن کسی مفہوم پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ اس کا خالص امریکی انداز تھا کہ جناب! صہیونیت نام کی تو کوئی چیز دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی۔ عرض ہے کہ حضرت! بحث مباحثہ کے لیے اور 'برائے شعر گفتن' تو یہ رائے اختیار کی جا سکتی ہے، لیکن فلسطین کی تحریکِ آزادی (انتفاضہ) میں اپنی آنکھیں، ہاتھ پاؤں اور عزیز و اقارب کھو دینے والے بچوں کو اسے قبول کرنے میں یقیناً دشواری پیش آئے گی، جن کے یہ زخم ابھی تک تازہ ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ان زخموں سے رستا ہوا خون اندھوں تک کو صاف نظر آ رہا ہے کہ جن کی 'نگہِ گوش' ان میں سے ابلتے ہوئے 'نغمے بخوبی دیکھ' رہی ہے(۲)۔

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش و خروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے

جب میں رچرڈز یونیورسٹی، امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکا تو میرے استاد اور دوست ڈیوڈ ویمر نے بڑی سرگرمی سے میرا تھیسس چھپوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ میں نے اپنے مقالے میں اس وقت (۱۹۶۹ء) کے لحاظ سے ایک بالکل نیا موضوع چنا تھا، یعنی (تاریخ کا خاتمہ اور انسان کی موت)(۳)۔ 'تاریخ کے خاتمے' کے قضیہ کو مَیں نے مغرب کی مادی تہذیب کی بنیاد میں پنہاں ایک اہم مسئلے کے طور پر لیا، اور اپنے مضمون انگریزی ادب کی رعایت سے تاریخی شعور کے حامل برطانوی شاعر ولیم ورڈز ورتھ اور تاریخ مخالف شعور رکھنے والے امریکی شاعر والٹ وٹمین کا تقابلی مطالعہ پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مؤخر الذکر، جسے ریاستہائے متحدۂ امریکا کے جمہوری فکر کے

علم بردار ایک بڑے شاعر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ در حقیقت آمریت، فاشیت اور تاریخ و انسان کی موت کا شاعر ہے۔ انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ استادِ محترم نے میرا یہ مقالہ بطور ایک تعلیمی تحقیق کے، 'یونیورسٹی ریسرچز' شائع کرنے والے مختلف ناشرین کو اپنی خاص سفارش کے ساتھ بھیجا۔ ہر جگہ سے معذرت کے خطوط موصول ہوئے، بغیر کسی وجہ کے صاف انکار لیے یا الٹے سیدھے مضحکہ خیز اسباب کے ساتھ۔ اوہاؤ یونیورسٹی کے اشاعتی ادارے نے اپنا معذرت نامہ یوں ترتیب دیا تھا کہ اوّلاً توصیفی کلمات کی 'ناشناس تحسین' سے لمبی چوڑی تمہید باندھی کہ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد مقالہ ہے، اس کا موضوع بالکل نیا ہے اور یہ امریکا اور برطانیا کے رومانوی ادب کا پہلا اور بھر پور تقابلی مطالعہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں یہ مذکور تھا کہ اوہاؤ یونیورسٹی کی علمی و اشاعتی کمیٹی اسے شائع کرنے سے معذرت کرتی ہے کہ مقالہ نگار نے 'امریکی چرواہوں کی ایک مقدس گائے' والٹ وھٹمین کو رگیدا ہے، جو فطرت کے ساتھ فعلِ بد ہے، جسے منظرِ عام پر لانے کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس ایک اہم 'علمی' سبب کے علاوہ شائع نہ کرنے کی کوئی اور 'غیر جانبدارانہ' علمی وجہ نہیں بتائی گئی۔

ایک عربی اخبار کے پہلے صفحے پر جلی عنوان کے ساتھ بھارت میں ٹرین کے ایک حادثے کی خبر شائع ہوئی۔ حادثے میں پچاس آدمی لقمۂ اجل بنے اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اخبار کے اسی شمارے میں آخری صفحے پر سماجی سرگرمیوں اور فلم اسٹاروں کے نوادر و لطائف اور اسکینڈلوں پر مبنی خبروں کے ساتھ ایک جانب مختصر سی ایک 'غیر اہم' خبر تھی کہ انگلینڈ میں ناجائز بچوں کی تعداد پچیس ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ عالمی نیوز ایجنسیوں کے فراہم کردہ اعداد و شمار تھے۔ مجھے بتایئے کس نے یہ طے کیا کہ ماں باپ کی شفقت و محبت کے مانوس گھریلو ماحول سے محروم دنیا کی آزمائش میں دھکیلے جانے والے ناجائز بچوں کی 'فوجِ ظفر موج تعداد' میں پیدائش کا حادثہ، ایک گاڑی کے ٹرین سے ٹکرانے پر سو پچاس (یقیناً) قیمتی جانیں ضائع ہونے کے حادثے سے نہ صرف یہ کہ انتہائی کم اہمیت کا حامل ہے، بلکہ اسے ایک لطیفے اور مزے کی خبر کے طور پر پیش کیا گیا، بعینہٖ اس 'لذیذ خبر' کی طرح کہ فلاں مشہور اداکارہ نے 'چوتھی کے بعد پانچویں شادی' اس نوجوان سے رچائی جو اس کے بیٹوں کی عمر میں ہے۔ (خامہ انگشت بدنداں ہے...!)

جب گورے سامراجی افریقا پہنچے تو وہاں کی عورتوں کے برہنہ جسم انھیں انتہائی پس ماندگی اور ابتدائی انسان کی حیوانی شہوانیت کے نمائندہ نظر آئے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مغربی عورتیں اپنے جسم کے تقریباً سبھی اعضاء غایت درجہ کے مہذب انداز سے ڈھانپ کر رکھا کرتی تھیں۔ مگر اب جبکہ 'زمانے کے انداز بدلے گئے' ہیں اور ترقی کا دور دورہ ہے، مغرب کا انسان تن برہنہ لوگوں کی

'کالونیوں' کو ترقی کی معراج اور وسعتِ ذہن کی آئینہ دار قرار دیتا ہے کہ جہاں 'تنگیِ ذہن' اور 'ضیقِ صدر' کا علاج کیا جاتا ہے۔ یعنی پچاس سال سے کم عرصہ میں مہذب مغربی انسان نے 'ہمہ ستری' سے لے کر 'عریانیِ عورۃ' تک کی منزلیں بکمالِ 'حسن و خوبی' اور بڑی 'کاوش و تن دہی' کے ساتھ طے کر لیں، اس طرح کہ پہلے وہ برہنگی سے بیر رکھتا تھا اور اب لباس سے۔ یہی وجہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاں عورت اب 'چار گرہ' سے زیادہ کپڑا پہننے کی قطعاً متحمل نہیں ہوتی۔ اسی بات کو ہم اصطلاح میں مغربی تہذیبی پیٹرن کا تحیُّز (میلان و جانبداری) کہیں گے۔ اب اس تہذیبی ترقی کے بعد اگر کوئی کم لباسی پر اعتراض کرتا ہے، اسے فحاشی گردانتا ہے اور 'اخلاق کے جمالیاتی' یا کم از کم 'جمالیات کے اخلاقی نقطۂ نظر' سے اسے درست قرار نہیں دیتا، تو اُسے اپنے محدود ذہنی افق کا مداوا تہذیب و ثقافت پر 'توسیعی لیکچروں' سے اور 'تنگیِ دامان و نظر' کا علاج 'بسم اللہ کے گنبد' سے نکل کر دنیا کے اس وسیع و عریض گلشن کے 'کھلے ماحول' میں کسی 'چنبیلی کے منڈوے تلے' بھی نہیں، بلکہ بیچ چوراہے کسی 'مسیحائے گل بداماں' سے کروانا چاہیے۔ خواہ مخواہ کے اخلاقی، مابعدالطبیعیاتی اور 'کائناتی'، نیز 'کوہِ ندا و گنبدِ بے در' والے مسائل میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہیے (کہ آخر: کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را)۔ دنیا آگے بڑھ چکی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ اب 'گل محمد اور اس کی بے جنبش زمین' کے استعاروں کو ترک کرتے ہوئے 'بے ستون قصرِ گرداں' کے مانند لازم ہے کہ: چلو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو۔ (دُر مع الدہر کیفما دار!)۔ یہ ہے مغربی تہذیب کی وہ خاص الخاص بنیادی خصوصیت کہ ٹھوس اور مائع کی دو انتہاؤں کے درمیان اس کی ترقی کا سفر کس طرح پلک جھپکتے میں طے ہوتا ہے۔

تحیُّز کی تعریف

دنیا کی ہر چیز، ہر واقعہ، ہر حرکت، ہر سکنت کا کوئی نہ کوئی ثقافتی پہلو ضرور ہوتا ہے، جو علم و دانش کے کسی خاص نقطۂ نظر یا پیٹرن کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ پیٹرن، حقیقت کی ایک مجرد عقلی یا تصوراتی شکل ہوتا ہے، ایسی شکل جو علامتی طور پر حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ پیٹرن ایک ایسے تجریدی (= تجزیاتی اور ترکیبی) عمل کے نتیجے میں تشکیل پاتا ہے جس میں انسانی عقل گرد و پیش کے ماحول کی بعض خصوصیات کا انتخاب کرتے ہوئے انھیں ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ترتیب میں لا کر ایک مرکب شکل عطا کرتی ہے۔ اس عمل کے دوران کبھی وہ ان خصوصیات کو اس طرح بڑھا پھیلا کر سامنے لاتی ہے کہ ان کے درمیان بظاہر نظر آنے والا تعلق، اصل ماحول میں ان کے درمیان پائے

= نظام میں پنہاں ایک بنیادی مسئلے کے طور پر لیا اور اسے شعراء کے تقابل میں استعمال کیا۔ مترجم

جانے والے تعلق کے مساوی تصور کیا جائے۔ اس میں تخصیص بھی در آتی ہے، اور تشکیل پانے والا پیٹرن، مثال کے طور پر، صرف مادی اور اقتصادی نوعیت کا ہو سکتا ہے، یا پھر تہذیبی شکل و صورت کا، بایں نمط کہ یہ کسی تہذیب کو متشکل کرنے والے تمام سماجی، معاشی، سیاسی اور دیگر عناصر کے تعلقات کو یوں سمیٹ کر پیش کرتا ہے کہ اس تہذیب کے پروردہ مظاہر و رسوم، اشیاء و احوال اور نظامہائے کار کی ایک پوری عقلی، تصوراتی شکل ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

اس طرح پر تشکیل پانے والے ہر پیٹرن کے پیچھے اس کا اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے جو ان معیاروں کو محیط ہوتا ہے جن پر اس کی الگ حیثیت کا دار و مدار ہو۔ یہ معیار مختلف اعتقادی اور مسلمہ و فرضی امور پر مشتمل ہوتے ہیں، اور پیٹرن کی بنیاد اٹھانے والے مختلف کُلّی نوعیت کے سوالوں کے جواب انھی معیاروں سے متعین ہوتے ہیں۔ یوں ہمیں اس پیٹرن یا نظام کی اصل و غایت کا پتا ملتا ہے۔ یہ معیارات اور انھیں تشکیل دینے اور پیٹرن کی علتِ غائی بتانے والے سبھی امور پیٹرن کا جوہر ہوتے ہیں، جو اس کی شکل و صورت، حدود قیود اور اس کے حوالے سے چیزوں کی قانونی، عرفی، اضافی اور مستقل حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔ الغرض یہ پیٹرن کا مرجع و اساس ہوتے ہیں، اور انسان، خدا اور کائنات کے حوالے سے مختلف کلی نوعیت کے فلسفیانہ سوالات کا جواب اپنے 'مسلمہ فرضیات' کے تحت مہیا کرتے ہیں۔ 'مسلمہ فرضیات' اس لیے کہ ہر فلسفہ لازمی طور پر اعتقاد کا پہلو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، یعنی وہ یقینی طور پر کسی نہ کسی پہلے سے طے شدہ امر یا امور کے مجموعے پر ہی اپنی بنیاد استوار کرتا ہے، اور انھی کی رو سے ہر پیش آمدہ یا ممکنہ طور پر پیش آنے والے سوال کا جواب مہیا کرتا ہے۔ یہ کلی نوعیت کے سوال کچھ یوں ہیں: شش جہات میں پھیلی اس کائنات میں انسانی یا مجرد وجود کا مقصد کیا ہے؟ آیا انسان فقط مادی عناصر میں ایک خاص انداز کی ترتیب سے ظہور پذیر ہوا ہے، یا مادے اور روح کا مرکب ہے؟ نیز روح کیا ہے؟ کائنات کا مرکز و محرک اس کے اندر ہی کہیں موجود ہے یا اس سے الگ اپنا خارجی اور مستقل وجود رکھتا ہے، یا پھر داخل میں رہتے ہوئے اس کی خارجی حیثیت ہے(۴)؟

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو بے حدّ و حساب اشاروں اور علامتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اپنے شعوری و غیر شعوری علمی یا معلوماتی پسِ منظر کے تحت وہ جیسے تیسے ان سے عہدہ برآ بھی ہوتا ہے، (بھلے گریز کا رویہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے)۔ بعض 'جدیدیت' پسندوں کے بقول تو دنیا جہان کی کوئی چیز بھی (ابتدائی طور پر) اشارہ و علامت سے خالی نہیں۔ اگرچہ خود یہ نقطۂ نظر بھی اپنی خاص (اور میرے یا کسی اور کے لیے ناپسندیدہ) چھاپ یا علامت اور جانبداری، یعنی تحیُّز سے مبرّا نہیں

ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس نے دنیا کو پہلے تجربے کی سان پر چڑھایا، پھر معلومات کے رندے سے بے طرح چھیل کر رکھ دیا، بایں طور کہ اب اس کے مطابق ہمارے لیے اس پہلی (اور فطرت کے وجود سے علیٰحدہ) معصومیت یا سادگی کی طرف لوٹنا ممکن نہیں جس سے انسان اپنی انسانی حیثیت اور ذات کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ یہ بات ایک طرف رہی، اپنا موقف پیش کرنے کا خود میرا یہ طریقۂ بیان بھی اشارہ و تحیُّز سے خالی نہیں، کہ مختصر سی تمہید کے بعد یکلخت مَیں نے چند غیر معروف مثالیں اور واقعات آپ کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیے، جن کے بعد کچھ نسبتاً جانی پہچانی مثالیں پیش کیں، اور آخر میں سب کے ہاں معروف و معلوم حکایات و امثلہ۔ یہاں وہاں ہلکے پھلکے اشاراتی انداز میں انھیں تجزیہ و تحلیل سے مزین کیا، اور ایک خاص انداز سے یوں ترتیب دیا کہ اس میں رمز و ایماء یا کم سے کم تلازمے کا پہلو ضرور نکلے۔

اپنے مقالے کا آغاز مَیں نے تحیُّز کی تعریف سے نہیں کیا۔ بلکہ معکوس طریقے پر، خاص سے عام کی جانب سفر کرتے ہوئے اپنے خیالات ایک متعیّن انداز سے ان مثالوں کے ذریعے پیش کیے جو ہماری زندگی اور علم (یا معلومات) کا حصہ ہیں۔ نیز کسی نہ کسی حوالے سے اپنے بعض ذاتی تجربات بھی شاملِ تحقیق کیے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقی سطح پر یہ طریقہ معروف 'علمی' انداز کا نہیں۔ یقیناً یہ طریقہ 'معروف علمی انداز' کا نہیں ہے، لیکن میرے خیال میں یہ اُس طریقے سے بہتر ہے کہ دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ سامع یا قاری اکتاہٹ کا شکار بھی نہیں ہوتا اور اصل بات بھی براہِ راست اور 'علمیت کے رعب' سے اس کا ذہن ماؤف کیے بغیر اس تک پہنچ جاتی ہے۔ علاوہ بریں، وہ حالات و واقعات کے اپنے ذاتی تجربے کی جھلک بھی اس میں دیکھتا ہے، جس سے انھیں سمجھنے اور علم و تحقیق سے ان کا ربط جوڑنے میں آسانی رہتی ہے۔ اس کے برعکس، خالص 'علمی و تحقیقی' طریقۂ بیان کے دلِ دادگان کے نزدیک علم و تحقیق کو 'وعید سنانے والے واعظ' اور 'محتسب ِ شہر' کے چہرے کی طرح خشمگین و 'عبوساً قمطریرا'، یا کسی 'زاہدِ مرتاض' کے مانند 'خشک تار و خشک مغز و خشک پوست' ہونا چاہیے، (اس حد تک کہ 'آوازِ دوست' بھی گم ہو جائے)(۵)۔ نیز اس میں ذاتی تجربے کا بیان تو ان کے نزدیک 'گناہِ کبیرہ' کی ذیل میں آتا ہے۔ چنانچہ لازم ٹھہرا کہ ذات اور ذاتی تجربے کو 'ذاتی چیز' کے قطعاً نزدیک نہ آنے دیا جائے، مجہول کا صیغہ استعمال کیا جائے اور سمجھنے سمجھانے کے 'پُر عیب' اور 'مروی و منقول' عمل کو کسی بھی صوت 'دخل در معقولات' سے تحقیق کا 'پوتّر استھان بھرشٹ' کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس طرح بظاہر غیر جانبداری اور معروضیت کا ڈھونگ رچا کر مجھے یہ محققین اُس جانبداری اور داخلی موضوعی سوچ کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں جسے مَیں 'داخلی معروضیت' یا 'تاثر پذیر

غیر جانبداری' کا نام دوں گا، جو احساس و وجدان کو علم و دانش کے 'سایۂ تاک' میں تحقیق کے 'برگِ حشیش' کی چسکی پر لگا کر سلائے رکھتی ہے(۶)۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں باک ہے۔ میرے نزدیک انسانی زندگی کے تمام ظواہر، شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے بطون میں ارادہ و اختیار چھپائے بیٹھے ہیں، اور اسی کارن جانبداری کے حامل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جانبداری (تحیُّز) کہتے کسے ہیں؟ یہ ہے کیا بلا، کہ سب جہان جس سے خائف نظر آتا ہے؟!

لغت میں (تحیُّز) کسی نقطۂ نظر کی حمایت اور اس کے لیے طرف داری اختیار کرنے کو کہتے ہیں، اور یہ عربی مادے (ح و ز) سے بنے فعل (تَحَیَّزَ) کا مصدر ہے۔ قرآن میں اس سے مشتق اسم فاعل سورۂ انفال کی آیت نمبر سولہ میں یوں آیا ہے: ﴿اَوۡ مُتَحَیِّزاً اِلَیٰ فِئَةٍ﴾، جس کے معنی مفسرین نے (گروہ میں) شامل ہونے کے کیے ہے۔ قدیم لغت کی کتابوں میں سے بیشتر نے اس کا ذکر نہیں کیا، یا سرسری انداز سے اسے دوسرے الفاظ کے ضمن میں بیان کر دیا ہے۔ (لسان العرب) میں لکھا ہے کہ (تَحَیَّـزَ) در اصل (تَـفَـیْـعَلَ) کے وزن پر ہے، اس طرح (تَـحَـیُّـز) کا وزن (تَـفَـیْـعُل) ہوا۔ یہ (حَازَ) سے نکلا ہے، اور (حَازَ الشَّيءَ یَحُوزُهُ) کا مطلب ہے چیز کو اپنے قبضہ و ملکیت میں لینا اور اسے خاص اپنے لیے رکھنا، یا شے کو سمیٹنا اور ایک جانب کر لینا۔ صاحبِ لسان نے (تَحَوُّز)، (تَحَیُّز) اور (اِنۡحِیَاز) کو ایک ذیل میں رکھتے ہوئے تینوں کا ایک ہی معنی میں استعمال ہونے کا ذکر کیا ہے۔ عربی لغت کی جدید کتابوں میں مجمع اللغة العربیة، قاہرہ کی (المعجم الوسیط) اور اس کی توأم (المعجم الوجیز) میں البتہ ان مشتقات کو علیحدہ علیحدہ اور مرتب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں وضاحت ہے کہ (اِنۡحِیَاز)، (اِنۡحَازَ) سے ہے، اور (اِنۡحَازَ الۡقَوۡمُ) کا مطلب ہے لوگوں کا ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانا۔ (عَدَمُ الۡاِنۡحِیَاز) جدید اصطلاح میں بعض ملکوں کا کسی عالمی سیاسی قضیے میں غیر جانبداری اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ جبکہ (تحیُّز) کا لفظ کسی نقطۂ نظر کی حمایت اور اس کے لیے جانبداری اختیار کرنے، نیز کسی ایک رائے کو اپنانے اور دوسری آراء ترک کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

فقہ التحیُّز میں دو بنیادی قاعدے

1: تحیُّز ایک حتمی اور لا بُدّی امر ہے

تحیُّز انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ یہ انسانی عقل کی ساخت میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہماری عقل صورتِ واقعہ کی تفصیلات کسی بے حس مشینی آلے

کے مانند بلا کم و کاست اور انفعالی انداز میں اس طور پر ریکارڈ نہیں کرتی کہ ہمارے ارادے اور اپج کو اس میں ذرہ بھر دخل نہ ہو۔ بلکہ وہ اس دوران اپنا ایک فعّال کردار ادا کرتی ہے، اور بجائے حقائق و واقعات کی بعینہٖ اصل کے مطابق تصویر کشی کرنے کے، اپنے خاص علمی (یا معلوماتی) پسِ منظر والے پیٹرن کے زیرِ اثر مطلب کی کچھ تفصیلات لے لیتی ہے اور باقی سے تعرض نہیں کرتی۔ پھر ان لی گئی تفصیلات میں سے بھی کچھ کو بڑھا کر نمایاں کر دیتی ہے اور بقیہ کو ثانوی حیثیت دے کرمعاون کے طور پر ساتھ رکھتی ہے، جو ضرورت پڑنے پر سامنے آتی رہتی ہیں۔ اشیاء کے فہم و ادراک کا یہ عمل بے سوچے سمجھے اور اندھا دھند انجام نہیں پاتا، بلکہ ذہنی ساخت کا حصہ بن چکے تجربات اور معلومات پر مبنی مختلف نوعیت کے تعصّبات کے تحت وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ تعصّبات سارے کے سارے تو نہیں، لیکن ان میں سے کچھ کو شعوری سطح پر لا کر ان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

تحیُّز، اظہار کے وسیلوں میں بھی ایک زیریں لہر کے طور پر کام کرتا ہے۔ کوئی انسانی زبان ایسی نہیں جس کے الفاظ، حالات و واقعات اور تجربات ومحسوسات کو ان کی ایک ایک تفصیل سمیت پوری طرح سے بیان کرنے پر قادر ہوں۔ یعنی انتخاب لازم ہے۔ پھر ہر زبان بڑی حد تک اپنے تہذیبی ماحول سے جڑی ہوئی ہوتی ہے اور اسی کی پروردہ اشیاء کے حوالے سے کسی دوسرے ماحول کی چیزوں کو وصف و بیان میں لا سکتی ہے۔ نیز اظہار کی شکلیں ایک سے دوسری زبان میں مختلف ہوتی ہیں اور ایک زبان اور ایک ماحول میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں مجاز کا استعمال زبان کے تار و پود میں بکھرا ایک اہم عنصر کے حیثیت رکھتا ہے۔ زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں الفاظ کا آپس میں تبادلہ و تداخل ہوتا رہتا ہے، گو بڑی حد تک وہ اپنی صورت برقرار رکھتے ہیں۔ اسی طرح معانی بھی ایک دوسرے سے ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ تاہم وہ مرورِ زمان کے ساتھ، الفاظ کی نسبت زیادہ تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں۔ یہ بات اس چیز کی غماز ہے کہ انسانی زبان اشیاء کو غیر جانبدارانہ انداز سے الجبرا اور ریاضی کی طرح بیان نہیں کر سکتی، بالکل ویسے ہی جیسے الجبرا اور ریاضی کی زبان سادہ سے سادہ انسانی عمل یا رویے کو اس کے تمامتر محسوسات سمیت بیان کرنے سے قاصر ہے۔ گویا انسان کی زبان کہیں زیادہ باثروت، پیچیدہ اور مرکب ہے، اور اپنے اندر بے اندازہ امکانات اور اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ لیکن اس سب کے باوصف، زبان نہ صرف یہ کہ احوال اور اشیاء کو بتمام وکمال بیان نہیں کر سکتی بلکہ ان میں شعوری اور غیر شعوری سطح پر معاشرے اور افراد کے مخصوص عقلی سانچوں کے مطابق اپنی طرف سے کچھ یا کچھ سے زیادہ تعصّبات بھی شاملِ اظہار کر دیتی ہے۔

اس تمام بحث سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جانبداری یا تحیُّز انسان کی اصل و نہاد میں شامل، بلکہ

انسان ہونے کے مفہوم میں داخل ہے۔ یہ اس حیثیت سے کہ انسان فطرت سے الگ مخلوق ہے، اور اسے فطرت کے عام قوانین کے مطابق ڈھالا اور پرکھا جا سکتا ہے نہ وہ پورے طور سے ان کا تابع ہے۔ چنانچہ جو شے بھی انسان کی ساختہ ہے، وہ لازمی طور پر ذاتیت اور انفرادیت کی حامل ہو گی، اور نیتجتاً جانبدار (متحیّز) کہلائے گی۔ اگر ہم تہذیب کی حد یہ قرار دیتے ہیں کہ اسے فطرت کے مقابل انسان نے فطرت ہی کے علی الرغم تشکیل دیا ہے، تو ہر ثقافتی مظہر ضرور بالضرور متحیّز (جانبدار) ہوگا۔ بلکہ خود فطرت بھی تحیُّز کی نمائندگی کرتی ہے، بدیں صورت کہ انسان ہی اسے دریافت اور اس میں پائی جانے والی اشیاء کا (اتفاقاً ہی کیوں نہ ہو) انکشاف کرتا ہے۔ یہ سارا عمل بے سوچے سمجھے نہیں، بلکہ انسانی ادراک کے فعال کردار کی بدولت ظہور میں آتا ہے۔ فطرت کی کوئی بھی چیز جب انسان کے حیطۂ علم میں آتی ہے تو وہ اسے کوئی نام دیتا ہے، اور یوں اپنے ادراک سے وہ اسے فطرت کے جہان سے انسانی دنیا میں لے آتا ہے۔

2: تحیُّز حتمی ضرور ہے لیکن آخری یا حرفِ آخر نہیں

تحیُّز کی یہ حتمیت اور اس کا انسان اور انسان سے متعلق اشیاء سے وابستہ ہونا کسی پریشانی کی بات نہیں کہ اسے کوئی عیب یا کمزوری گردانا جائے۔ اس کے برعکس، تحیُّز کو اس کے منفی پہلوؤں سے الگ کرتے ہوئے ایک مختلف وضع میں لا کر مفید اور کار آمد بنایا جا سکتا ہے۔ یوں کہ ایک دوسرے کے تعصّبات اور مفادات کا آپس میں تصادم ختم یا کم کرتے ہوئے انھیں انسان کی تعمیری کاوشوں کو مہمیز دینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ مان لیا جائے کہ تحیُّز انسان کے ارادہ و اختیار اور اس کی انفرادیت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ انسان اگر مجموعۂ اضداد ہے، رنگا رنگ طبیعت کا مالک ہے، اور یہی انسان کا اصل طرزِ حیات ہے، تو کیوں نہ اپنے اس تنوع، تضاد اور اختلاف کی کیفیت کو ہم آہنگی اور موافقت میں بدل لیا جائے۔ دوسرے کو اس کے تحیُّزات سمیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ مخالفت، سر پھٹول، دوسرے پر اپنی مرضی ٹھونسنے اور اسے اپنے خاص الخاص مقصد کے لیے استعمال کرنے کی مادی یا معنوی کوشش سے ماحول کو نا خوش گوار اور نا قابلِ برداشت نہ بنایا جائے۔ اختلاف گوارا ہو سکتا ہے۔ (اے ذوق اس جہاں میں ہے رنگ اختلاف سے)۔ مگر مخالفت اور دوسرے کے ارادہ و اختیار کو سلب کر لینا یقیناً رواداری کا مستحق نہیں۔ تحیُّز کی یہ دو گونہ خصوصیت کہ وہ مختلف بھی ہے اور ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، انسانی دنیا بلکہ ساری کائنات میں پائی جانے والی ان ثنویتوں اور دوئیوں کی نمائندگی کرتی ہے جو باہم مقابل بھی ہیں اور تعمیری جہت سے ایک دوسرے کو بڑھاوا دینے کا فریضہ بھی ادا کرتی ہیں، اور جنھیں نہ صرف یہ کہ ختم یا ایک دوسرے

میں ضم کرنا ممکن نہیں، بلکہ ایسا کرنے کی اگر کوشش بھی کی جائے تو الٹا نقصان اور تباہی کا باعث ہو گا۔ انسان کی مشترکہ انسانیت ہی وہ جوہر ہے جو ہم سب میں ایک پوشیدہ مگر بے اندازہ طاقت کے طور پر موجود ہے۔ تاہم یہی مشترک پوشیدہ استعداد جب (بالقوہ) کے نہاں خانے سے نکل کر (بالفعل) کی جلوہ آرائی کی سمت قدم بڑھاتی ہے تو مختلف افراد، قوموں اور تہذیبوں میں اپنے قالب و ہیئت اور معنی و مضمون ہر دو سطح پر اختلاف کا رنگ جماتی ہے۔ یہی وحدت و کثرت کی وہ آنکھ مچولی ہے جس میں 'چمن آئینۂ بادِ بہاری کا زنگار' بنتا ہے (کہ: لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی)، اور یہیں سے تحیُّز اور رنگا رنگی جنم لیتی ہے۔ خدا کی مشیت نے انسان کو ایک فطرت پر پیدا کیا، مگر یہ نہیں چاہا کہ ہم ایک ہی رنگ میں رنگے یکسانیت کی اکتاہٹ کا شکار ہو کر فطرت کے آلۂ کار اور اس کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنیں، بلکہ انسان کو شعوب و قبائل میں بانٹ کر ہر ایک کو ('مکافاتِ عمل' دکھانے کے لیے) اپنے اپنے اختیار اور تحیُّز کی انفرادیت بخشی (۷)۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دوسرے کو نیچا دکھانے اور اس کی ذات اور انفرادیت کو سلب کر کے اپنے میں ضم کر لینے والی فطرت کی ازلی جبریت کو خدائی فوجداری ایسا فریضہ جان کر 'گربۂ فطرت' کے ہاتھوں میں 'زار و زبون موش' بن کر کھیلا جائے۔

صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر!

بنانے والا اگر چاہتا تو سب کو ایک قوم (امتِ واحدہ) بنا دیتا (۸) اور یوں اختیار اور جھگڑے کا ٹنٹا روزِ اول ہی سے ختم ہو رہتا، لیکن اس نے کرم کیا اور اپنے فضل سے ہمیں شعوب و قبائل کا اختلاف و تنوع اور فہم و ادراک میں کثرت و تعدد عطا کیا، اور اس کے ساتھ تعارف کا پہلو شامل کیا کہ تقابل و اختیار سے وقتی افادہ و استفادہ بھی کیا جا سکے اور تعمیر و ارتقاء کا تسلسل بھی ممکن ہو (۹)۔ انسانی زبان اپنی تمام تر محدودیت کے باوصف اس بات کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے کہ تعارف و ہمکاری کے عمل میں اور حق بات، حقائق اور حقیقتِ عظمیٰ کے سمجھ میں آنے والے پہلوؤں کو دوسرے تک پہنچانے میں انسان کی معاونت کرے۔ نیز اسے تحیُّز کی مختلف صورتوں کی تفہیم اور انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنے میں بھی مدد دے۔ یوں وہ دانش و معارف کے ایسے سانچے تشکیل دے جو کسی خاص تہذیب کے پروردہ تو ہو سکتے ہیں لیکن ایک اور مشترک انسانی میراث کا حصہ ہونے کے ناتے وہ آپس کے میل ملاپ، لین دین اور حالات و واقعات کی اونچ نیچ میں افہام و تفہیم کو ممکن بنائیں۔ رسولِ اسلام ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں پیدا ہوئے، لیکن انھیں مبعوث تمام انسانوں کے لیے کیا گیا۔ آپؐ نے تکبر، نسلی تفاخر اور ذات کے تحیُّز سے گزر کر آپس کے تعلقات میں انسان کی انسانیت کے

حوالے کو پیش نظر رکھنے پر زور دیا۔ چنانچہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے قوانینِ خداوندی کے اتباع (تقویٰ) کے لحاظ سے(۱۰)۔ یہ ایک مطلق اخلاقی قدر ہے اور ایسا زریں اصول جس پر یقیناً کوئی سودا بازی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اصولی ہدایت کی حامل اس مطلق قدر کے باوجود، عجمی کی شناخت عربی کی پہچان سے مختلف ہے، اور مشترک انسانیت کے حوالے کی طرح بس (تقویٰ) یعنی قوانین کا اتباع ہی انسانوں میں ایک مشترک قدر اور آخری حوالہ ہے۔ یہی بات ہمارے مجوزہ علم (فقہ التحیّز) میں اس دوسرے بنیادی قاعدے کا مفہوم ہے، کہ تحیُّز حتمی تو ہے لیکن آخری نہیں۔ حتمی یوں کہ اسے بیک قلم موقوف یا نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ انسان اور تحیُّز لازم و ملزوم ہیں، ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آخری اس لیے نہیں کہ یہ سفر کا نقطۂ آغاز اور نشانِ راہ تو قرار پاتا ہے، منزل نہیں۔ حرفِ آخر مشترکہ انسانی و اخلاقی اقدار ہیں جو کسی بھی اختلاف اور تحیُّز سے اوپر اٹھنے اور انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنے، اور آگے بڑھ کر حقیقتِ عظمیٰ کی پہچان اور کمال کی منزل کو چھونے میں مدد دیتی ہیں۔ جی ہاں، فقط پہچاننے اور 'لمس کے ذائقے' سے آشنا ہونے میں، حصول میں نہیں کہ حقیقتِ عظمیٰ اور کمال تو خود خدا ہے جو مشرقین یا مغربین یا کسی ایک فرد یا گروہ کا خدا نہیں، رب العالمین ہے۔

تحیُّز کی اقسام

تحیُّز (جانبداری) کی مختلف اقسام ہیں۔ ذیل میں ان کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے:

۱۔ ایک تحیُّز وہ ہوتا ہے جو انسان حق بات (سچ) کے لیے اختیار کرتا ہے۔ یہ اصولوں کی پاسداری اور قواعد و ضوابط کی پابندی، یعنی (التزام) کہلاتا ہے۔ حق اور سچ کا طرفدار (یا اس کے لیے متحیّز) انسان اپنے اعتقاد کے مطابق سچ سے متاثر اور حق کے لیے پرجوش ہوتا ہے، لیکن وہ اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اپنے ذاتی اعتقاد اور نظریات کو دوسرے کی اختیار کردہ حق اور حقیقت کی توجیہ اور اس سے متبادر نظامِ اقدار کے مطابق ڈھال سکے یا ہم آہنگی کا مظاہرہ کر سکے۔ وہ اپنی تحقیق کے نتائج کو کسی دوسرے معیار پر پرکھنے کے لیے تیار رہتا ہے، اور اپنے متحیِّز (جانبدار) نظریات کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ وہ یہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ نظریات اس کے ذاتی یا گروہی اجتہاد کا حاصل ہیں جو ضروری نہیں کہ فی الواقع درست ہوں۔

۲۔ حق کے لیے تحیُّز کے مقابل ایک باطل (جھوٹ) کا تحیُّز ہوتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں ذات، طاقت اور اقتدار کے تحیُّزات شامل ہیں۔ ذات کے لیے تحیُّز یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو واحد قابلِ قبول حوالہ و مرجع مان کر حقیقت کو اپنے طور پر سمجھنے یا کسی دوسری میزان پر تولنے

کی صلاحیت سے عاری ہو جائے، اور یوں کسی بھی نقطۂ نظر سے اس پر گرفت یا محاکمہ ممکن نہ ہو۔ طاقت کے تحیُّز میں کامیاب انسان دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا شائق ہوتا ہے۔ تاہم اگر وہ مغلوب ہو جائے تو 'مسندِ اسکندری' سے یا تو سیدھا 'قلندری کے سجادے' پر آ ٹکتا ہے یا بیشتر حالتوں میں افادی نقطۂ نظر اپنا کر حیلہ و منافقت سے کام لینے لگتا ہے۔ دوسرے کی آراء و نظریات سے بظاہر اتفاق کر لیتا ہے، لیکن دل سے نہیں مانتا۔ اس کی وابستگی اصولوں سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ طاقت سے سمجھوتا کرتا ہے اور گھات لگائے مستقل اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب حالات کا پلڑا اس کے حق میں جھکے اور وہ رُتوں کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے کر(۱۱) مخالف سے گن گن کر ایک ایک بات کا بدلہ لے(۱۲)۔ باطل یا جھوٹ کے لیے ان تحیُّزات میں تیسرا تحیُّز اقتدار کا ہے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی حیثیت اور ارادہ و انتخاب کی آزادی سے مکمل طور پر دست بردار ہو جائے۔ یوں ہر بات کے لیے اقتدار، مرجعِ وحید قرار پاتا ہے اور کرسی پر بیٹھا انسان حق کا اوتار۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتا ہے اور دوسرے بھی اس چیز سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ حق اور حقیقت کی نمائندگی اس کے پاس نہیں ہے۔ باطل کی ان تمام صورتوں کے لیے (خود اپنی مرضی سے یا حالات اور رویوں کے دباؤ، نیز شخصی یا گروہی مجبوری کے تحت) تحیُّز اختیار کرنے والا شخص اس بات کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنی ذات اور اختیارات کو کسی دوسرے نقطۂ نظر یا نظامِ اقدار کے مطابق ڈھال سکے یا ان کی پرکھ پرچول کر سکے۔ اس کے اوامر و نواہی اور صادر کردہ فیصلوں پر کسی نظرِ ثانی یا 'اپیل' کی گنجائش نہیں ہوتی، بلکہ وہ مطلق و دائم 'الوہی احکام' اور ثابت و قائم 'عالم گیر سچائیوں' کا درجہ رکھتے ہیں۔

۳۔ تحیُّز کی تیسری قسم شعوری اور غیر شعوری نوعیت کے تحیُّزات پر مشتمل ہے۔ شعوری تحیُّز واضح طور پر کسی نقطۂ نظر، اعتقاد یا آئیڈیالوجی کے اپنانے کو کہا جاتا ہے۔ اس آئیڈیالوجی کی عینک سے انسان دنیا کو دیکھتا ہے اور اسی کو اپنی تمام تر کاوشوں کا محور بنا کر دوسروں کو اس کی طرف بلانے اور قائل کرنے کی منصوبہ بندی بھی کرتا ہے۔ جبکہ غیر شعوری تحیُّز میں کوئی شخص کسی نظامِ فکر کو اس کی تمام تر ترجیحات اور نقطہ ہائے نظر سمیت اپنے لا شعور کا حصہ بنا لیتا ہے، اور پھر خواہی نخواہی اشیاء کو اسی تناظر میں دیکھنے لگتا ہے۔ شعوری تحیُّز عام طور پر واضح انداز میں اپنا اظہار کرتا ہے، بلکہ ضرورت کے تحت پروپیگنڈا اور سستی اشتہار بازی کا روپ بھی دھار لیتا ہے، جیسے کہ سیاست اور انتخابات کی مہم میں ہوا کرتا ہے، جس میں لوگ اصل بات سے تو یقیناً واقف ہوتے ہیں لیکن مفادات کی سطح پر اس سے متأثر ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل غیر شعوری تحیُّز پوشیدہ اور ملفوف انداز میں اپنا کام کرتا ہے، اور عوام

کی اس سے اثر پذیری لاشعور میں بیٹھے رسوب کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ تاہم بعض اوقات شعوری تحیُّز بھی مخفی طور پر اثر انداز ہونے کا ڈھنگ اپنا سکتا ہے، جیسے کہ تجارتی اعلانات میں اگرچہ جنسی جذبے اور فروخت کے لیے پیش کی جانے والی شے میں کوئی تعلق نہیں ہوتا، لیکن مشتہر بخوبی یہ بات جانتا ہے کہ اشتہار میں جنسی عامل کے طور پر عورت کی نمائندگی شے کی فروخت بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف قسم کے تجارتی اعلانات میں فروخت کنندہ کی طرف سے ناظر یا سامع کو ایک ایسا غیرانسانی مادی وجود فرض کر لیا جاتا ہے جس کا محرک بیفلوف کتے کی طرح جبلی اور شہوانی عناصر ہوں۔ یہی پوشیدہ و مخفی اندازِ ترغیب سیاسی اور اخلاقی سطح پر بھی بروئے کار لایا جاتا ہے، جیسے کہ امریکی فلمیں بہت سی ایسی اقدار کا پرچار کرتی نظر آتی ہیں جن میں ہالی وڈ کا شعوری تحیُّز زیریں سطح پر کام کر رہا ہوتا ہے، اور دیکھنے اور دیکھ کر متاثر ہونے والا شخص اپنے شعور کی سطح پر اس کا ادراک نہیں کر پاتا۔ ان اقدار میں تشدد اور دوسرے کو پچھاڑنا یا پیچھا کر کے ہر ممکنہ طریقے سے اس کا ناطقہ بند کرنا شامل ہیں۔ اس قسم کی اخلاقی اقدار کو، جو ماحول کے بارے میں ڈارونی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں، اگر بغیر کسی فلمی وسیلے کی دلچسپ پیشکش کے، اپنی اصل حالت میں براہِ راست سامنے لایا جائے تو ہمیں ان سے گھن آئے۔ اسی لیے انھیں 'کاؤ بوائے' کی فلموں اور 'ٹام اینڈ جیری' ایسے کارٹونوں کی صورت میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے ان میں تشدد اور گنوار پن ایسی وحشی اقدار یا سوچ فہم اور کردار کے کسی خاص پیٹرن کی تلقین نہیں کی جا رہی، بلکہ یہ سب ایک سادہ اور بے غرض قسم کی تفریح ہے جس میں ہرگز ہرگز کوئی 'رمز' پوشیدہ نہیں۔ (ہم اس 'تفریحی تصادم' کو 'حق و باطل کا معرکہ' نہیں کہہ سکتے۔ نیز اینچ اور شوخی کے بھی دیگر بہتر انداز ہو سکتے ہیں۔)

۴۔ تحیُّز کو شدت اور نرمی کے لحاظ سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تحیُّز کبھی اپنے اندر بڑی شدّت و حدّت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس حقیقت نگار اشتراکی ادب کی طرح جس میں مزدور طبقہ ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے اور 'بورژوا' ہر حال میں زمیں بوس ہو کر رہتا ہے۔ پڑھا لکھا سمجھ دار بورژوائی، البتہ، 'تاریخی جبر' سے واقف ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اب مزدور طبقہ ہی 'چھا جانے والا' طبقہ ہے اور 'بورژوا' حتمی طور پر اپنی جگہ بڑھتی ہوئی اشتراکی طاقتوں کے لیے خالی کر دے گا۔ یوں وہ اپنی قدیم طبقاتی سوچ کو شعوری سطح پر ترک کر کے اس طبقے سے آ ملتا ہے، تاکہ تاریخ کے اس دھارے میں 'حق کا ساتھ' بھی دے اور اس کی 'رہنمائی' بھی کرے۔ اس طرح اشتراکی نقطۂ نظر کا حامل ناول کسانوں، مزدوروں اور دانشوروں کے 'لا محالہ وقوع پذیر ہونے والے انقلابی اتحاد' پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ تاہم سارے تحیُّزات اس نوعیت کے 'فضیحت آمیز' انداز و انجام کے حامل نہیں ہوتے۔ انسان کا

کسی خاص اعتقاد یا آئیڈیالوجی کا قائل ہونا اور اس کا دفاع کرنا کوئی حیرت کی بات نہیں، لیکن اس کے ساتھ اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ پروپیگنڈا کرنا اور دعوت دینا اور چیز ہے، اور اس کا عملی نفاذ دوسری بات۔ نیز اس آخری عمل میں یقیناً بہت سی ایسی رکاوٹیں بھی در پیش ہوں گی جنھیں بآسانی راستے سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔

تحیُّز کی کارفرمائی علم و دانش اور صنعت و حرفت کے ایک سے دوسرے میدان میں مختلف اور کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ امر کسی خاص قوم یا جماعت میں اس علم یا صنعت کی ثقافتی اور تہذیبی حیثیت و اہمیت سے منسلک ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی اعتقادات اور انفرادی و اجتماعی روایات اور تعلقات میں تحیُّز بڑی شدید نوعیت کا ہوا کرتا ہے۔ یہی حال ادب و فن اور فکر و فلسفہ میں ہے۔ ٹیکنالوجی اور صنعتی ترقی کے میدانوں میں تحیُّز درمیانے درجہ کا ہوتا ہے، جبکہ طبیعیات، کیمیا، ریاضی اور طبعی تاریخ ایسے مجرد علوم تحیُّز سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں، لیکن ہوتے ضرور ہیں کہ آخر وہ بھی انسان ہی کی فکری و علمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

۵۔ پھر ایک تحیُّز کے اندر بھی مختلف نوعیت اور درجہ کے کچھ تحیُّزات ہوتے ہیں۔ یہ تحیُّز اس وقت بالکل نکھر کر سامنے آ جاتا ہے جب مثال کے طور پر کوئی تحقیق کار کسی بڑے اور مکمل علمی پیٹرن کے اندر ایک معین نقطۂ نظر کے تحت اپنی تحقیق بروئے کار لاتا ہے۔ یوں وہ پیٹرن پھیل کر ایک سے زیادہ تحیُّزات خود میں سمو لیتا ہے۔ چنانچہ تحقیق کا موضوع بنائے گئے کسی ایک نظامِ فکر و فلسفہ میں کچھ افکار پر، اسی میں شامل دوسرے افکار کی نسبت زیادہ توجہ مرکوز کرنا تحیُّز کے اندر تحیُّز کہلائے گا۔ ہمارے ہاں (مصر وغیرہ میں) سماجی علوم کے جرمن نظریات کی نسبت فرانسیسی یا برطانوی نظریات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، باوجودیکہ یہ تمام نظریات مغربی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یا جیسے ہمارا کوئی مذہبی اسکالر اسلامی قانون کے کسی خاص پہلو کے لیے، بقیہ پہلوؤں کی نسبت یا ان کے مقابل، تحیُّز اختیار کرے، اور اس کا مقصد دوسرے پہلوؤں کی اہمیت کم کرنے کی بجائے اختیار کردہ پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا یا وقت کی ضرورت کے لحاظ سے اس کی اہمیت پر زور دینا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی نظر اسلامی قانون کے تمام پہلوؤں کو محیط نہ ہو، اور دوسری مختلف یا مخالف آراء کا جائزہ لیے بغیر وہ کسی شے کو حرام یا حلال قرار دے ڈالے، جبکہ فی الواقع فقہی قانون میں ایسا نہ ہو۔

۶۔ تحیُّز کے اندر تحیُّز والی صورت کے مقابل کوئی تحقیق پرداز بیک وقت مختلف اور متضاد نقطۂ نظر کے حامل دو یا دو سے زیادہ نظام ہائے افکار کے لیے بھی تحیُّز اختیار کر سکتا ہے، خواہ یہ عمل مفیدِ

مطلب شے کے حصول کی خاطر سوچ سمجھے انداز میں بروئے کار لایا جائے یا پوری اور گہری واقفیت حاصل کیے بغیر وہ ان باہم متخالف نقطہ ہائے نظر میں کوئی امتیاز نہ کر سکا ہو۔ چنانچہ یہ ہو سکتا ہے کوئی مقرر یا ادیب 'عہدِ روشن' کے عقلی رویوں اور رجائی نقطۂ نظر کو اپنی تحریر و تقریر میں جگہ دے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ 'جدیدیت' کے نقطۂ نظر سے قنوطی انداز کے حامل شعر بھی کہتا ہو، جو زندگی کی بے معنویت، انسانی وجود کی بے بضاعتی اور حالات کے جبر میں رہتے ہوئے عقل وفہم کے استعمال کی بے فائدگی ایسے مضامین پر مشتمل ہو۔ اسی طرح کسی مغربی لکھاری کے لیے عین ممکن ہے کہ اسلام، ہندومت اور کانفیوشس ازم کی مختلف و متنوع آراء سے اس لحاظ سے متاثر ہو کہ یہ سب کی سب 'دانشِ مشرق' کی نمائندہ ہیں۔

۷۔ تحیُّز کی ایک تقسیم جز اور کل کے لحاظ سے بھی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اشیاء و افکار کے کسی مجموعے سے کبھی کوئی ایک شے یا فکری عنصر لے کر دیگر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مغرب کا کوئی ادیب جب کسی مشرقی ادیب یا رویے سے متأثر ہوتا ہے تو وہ اس ادیب یا اس کے رویے میں کارفرما فلسفے یا اس سے منسلک تہذیبی پیٹرن کو پورے طور پر تسلیم یا اختیار نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ اس کے صرف وہ عناصر لیتا ہے جو اس کی دلچسپی کا باعث ہوں اور جنھیں وہ اپنے تصورِ کائنات میں جگہ دے سکتا ہو۔

اس کی ایک دلچسپ مثال آرتھر فٹز جیرالڈ ہے، جس نے انیسویں صدی میں عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی میں آزاد شعری ترجمہ کیا۔ شعوری یا لاشعوری طور پر اس نے ایران کی مسلم تہذیب سے اس عنصر کا انتخاب کیا جو اس کے وکٹوریا عہد کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا، یعنی جس میں کائنات سے ایک گہری بے گانگی اور عدم ہم آہنگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور مثال گوئٹے کا حافظ شیرازی سے متأثر ہو کر اپنا مشرقی دیوان ترتیب دینا ہے۔ دوسری طرف ہمارے کئی ادیبوں شاعروں کی مثال ہے جو شیکسپیئر سے متأثر ہوئے اور اس کے بعض ڈراموں اور نظموں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ تاہم یہ بات ان کے پیشِ نظر رہی کہ شیکسپیئر کے تصورِ کائنات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے فقط وہ چیزیں انتخاب کریں جو ان کی اپنی یا قاری کی دلچسپی کا باعث ہوں، یا جن سے ان کے کسی موقف کو تقویت ملتی ہو۔ اس جزوی تحیُّز کے مقابل کلی تحیُّز میں کسی نظامِ فکر وعمل کو اس کے تمام تر پہلوؤں، خوبیوں خامیوں اور ضمنی یا داخلی تعصُّبات سمیت قبول کیا جاتا ہے۔

جزوی تحیُّز میں متحیّز (جانبدار) شخص اپنی ذات پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے ایک طے شدہ نقطۂ نظر

کا حامل ہوتا ہے اور اس کی اپنی ایک پہچان ہوتی ہے، جس میں وہ اپنے تہذیبی پیٹرن سے استناد کرتا ہے۔ اس کے اپنے تحیُّزات ہوتے ہیں جن کے حوالے سے وہ کسی دوسرے تہذیبی یا ثقافتی پیٹرن سے اخذ و استفادہ کرتا ہے۔ وہ اشیاء اور نظریات کی در آمد کا مخالف ہوتا ہے نہ اس عمل سے خائف، لیکن انھیں اپنے معیاروں پر پرکھنے اور اپنے تحیُّزات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ وہ ذہن کھلا رکھنے کا قائل ہوتا ہے اور نئی بات قبول کرنے پر آمادہ رہتا ہے، لیکن دوسرے کی میزان پر اشیاء کو تولنے اور بجائے متکلم، غائب کے صیغے میں بولنے کا روادار نہیں ہوتا۔ وہ خود بھی مجتہدانہ ذہن کا مالک ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اس سارے عمل کو ایک طرف کسی بند اور تنگ نظام کے اندر رہتے ہوئے یا پھر حدود و قیود سے ما ورا ہو کر نہیں، بلکہ ایک جامع تہذیبی نظام کے کشادہ ماحول میں اپنی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے انجام دینے کا قائل ہوتا ہے۔ وہ 'سامراجی کلیہ جات' اپنانا گوارا نہیں کرتا، یعنی بجائے دوسرے سے اپنے ماحول اور مزاج کے موافق چیزیں اور آرا لینے کے، اس کا تصورِ کائنات اور تجزیہ وتحلیل کے بنیادی اصول لے کر انھی کے حوالے سے اشیاء اور افکار کو جانچنا شروع کر دیا جائے۔ یقیناً یہ نقطۂ نظر علمیت کا حامل نہیں، بلکہ اپنی ذات، اپنے ماحول اور اپنے تہذیبی سانچوں سے پھوٹا اجتہاد ہی علمی نقطۂ نظر کا حامل ہوا کرتا ہے۔ انسانی علم کلی احکام اور مطلق نوعیت کے یکساں معیارات سے نہیں، جزوی اور معروضی حقائق نیز پرکھے جانے والی اشیاء سے تعرض کرتا ہے۔ وہ ان اشیاء یا افکار کی سچائی، حقیقت اور معیار کا تعین خود انسان پر چھوڑتا ہے کہ انھیں اپنے اعتقاد، روایات اور ماحول کے مطابق جیسے مناسب سمجھے متعین کرے۔ اس کے برعکس، دوسرے کی آراء اور نظریات کو بے سوچے سمجھے قبول کر لینا، اس کے معیارات اور تجزیاتی کلیہ جات کو اختیار کرنا ہے، جو اپنی ذات کی نفی اور ایک شکست خوردہ انفعالی رویہ ہے۔

۸۔ دورِ جدید کے تحیُّزات میں ایک بڑا اور اہم تحیُّز ہمارے مادی حالات کا ہمارے خلاف تحیُّز ہے، جس کی پچھلے ادوار اور تہذیبوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کا آغاز یوں ہوا کہ مغربی استعمار نے ہمارے دیار و ممالک میں قدم رکھنے کے بعد ہماری تہذیبی شناخت اور اقدار کے محافظ گھروں اور شہروں کو ڈھا کر اپنے نظامِ اقدار کے موافق شہر تعمیر کر کے بسائے۔ اس کی ان اقدار میں تیزی، کام کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور مسابقت شامل ہیں۔ چنانچہ سڑکیں کشادہ اور کھلی کھلی رکھی گئیں کہ بہت سی گاڑیاں بیک وقت تیزی کے ساتھ گزر سکیں۔ گویا یہ فرض کر لیا گیا کہ گاڑیوں کی بہتات ہے اور سب لوگوں نے ایک ہی منزل پر جلد از جلد پہنچنا ہے۔ اس کے مقابلے میں پہلی نوعیت کے شہروں

کو اگر نئے سرے سے تعمیر کیا جائے تو ان میں ترجیحات مختلف ہو سکتی ہیں۔ یعنی اس بات کو پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے کہ پیدل چلنے والے 'گاڑی بانوں' سے تعداد میں زیادہ ہیں، یا یہ کہ 'پبلک ٹرانسپورٹ' استعمال کرنے والے ذاتی گاڑی رکھنے والوں سے زیادہ اہم ہیں۔ جدید طرز پر تعمیر کیے گئے شہروں میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ انتظامیہ کی گرفت مضبوط رہے، تا کہ کوئی سماجی، عوامی تحریک سر نہ اٹھانے پائے اور لوگوں کو بآسانی تابعِ فرمان رکھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید یورپی شہروں کی وسیع و عریض سڑکیں لاطینی زبان میں حربی گزرگاہوں (Via Militares) کے نام سے پکاری جاتی ہیں، یعنی جن کے ذریعے حکومتی سپاہ بسہولت تمام شہری آبادیوں میں داخل ہو سکے اور عوام یعنی 'پبلک' کی گوشمالی کر سکے تا کہ وہ ان 'پبلک مفادات' کے 'صراطِ مستقیم' سے انحراف نہ کریں جو 'پبلک' سے زیادہ مقتدر طبقے کے مفادات ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، گلی نما نسبتاً غیر کشادہ راستے گاڑیوں اور مسلح لشکروں کی جگہ پیدل چلنے والوں کی گزر گاہ ہوتے ہیں۔ گھر اب اس قسم کے مواد سے تعمیر کیے جاتے ہیں جس سے 'ائر کنڈیشننگ' ضروری ہو جاتی ہے، اور ان کی بناوٹ بھی اس طرح کی ہوتی ہے کہ ہمارے گرم ملکوں میں دھوپ زیادہ سے زیادہ ان میں داخل ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ دھوپ اور گرمی سے بچاؤ کی خاطر جدید طرزِ زندگی کی 'ضروری اشیاء' خریدنا لازم ٹھہرتا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص ذاتی گاڑی سے نجات پانا چاہے تو نہ صرف آنے جانے میں اس کا وقت ضائع ہوتا ہے، بلکہ روزمرہ کے تمام معمولات متأثر ہوتے ہیں اور زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر 'ائر کنڈیشنر' اور اس کی وجہ سے بڑھتے ہوئے بجلی کے بل سے نجات پانا چاہے تو پسینے میں بھیگ جاتا ہے اور کام کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ کام کے دن (Working Day) کا موجودہ تصور ہم نے مغرب سے لیا، جو درحقیقت مغربی ممالک کے لیے مناسب تھا۔ ہمارے ہاں اوقاتِ کار، عام طور پر، فجر کے بعد سے لے کر دوپہر تک ہوتے ہیں، جس کے بعد آرام کا وقت اور پھر سہ پہر کے وقت لوگ اپنے دیگر سماجی معمولات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عشاء کے بعد کا وقت سونے کے لیے ہے۔ تقسیمِ کار کا ہمارا یہ روایتی تصور آج بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے، اور مناسب جانچ پرکھ کے بعد اسے باقاعدہ عمل درآمد کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کام کی زیادہ صلاحیت دستیاب رہتی ہے۔ نیز جسمانی آرام کا موقع بھی خوب ملتا ہے اور خواہ مخواہ کے نفسیاتی دباؤ سے بھی آدمی محفوظ رہتا ہے۔ کام اور آرام کے لیے وقت کی یہ تقسیم ہمارے خطوں کے لیے کائنات کے نظامِ اوقات سے بھی موافقت رکھتی ہے۔ عین ممکن ہے اسے اپنانے سے ہم دوسرے کی پیروی میں اختیار کردہ ان پابندیوں سے نجات حاصل کر لیں جو 'بنی اسرائیل کی پوچھ پوچھ کر لاگو کرائی گئی بندشوں' سے مشابہ ہیں۔ اس طرح

ہم اپنا تخلیقی جوہر بجائے کسی کی اندھی تقلید میں ضائع کرنے کے، مثبت اور تعمیری انداز میں اپنے ماحول، حالات اور انسانی رویوں کو بہتر بنانے میں صرف کر سکتے ہیں۔

مغرب کے تہذیبی پیٹرن کی طرف جھکاؤ

چند مثالیں

۱۹۶۳ء میں جب مجھے تعلیم کے سلسلے میں امریکا جانے کا اتفاق ہوا تو ییل یونیورسٹی میں 'سمر ٹرم' کے دوران ایک دفعہ (اپنے مضمون انگریزی ادب کی مناسبت سے) شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ دیکھنے اپنے ہم درسوں اور اساتذہ کے ہمراہ تھیٹر کو چلا۔ میں نے کوٹ پہنا ہوا تھا نہ نکٹائی زیبِ گلو تھی، بلکہ اپنی پسند کے آرام دہ لباس میں تھا۔ جس پر ایک استاد نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ کیا شیکسپیئر کے لیے تم کوٹ اور نکٹائی بھی نہیں پہن سکتے؟ میں فوراً واپس ہوا اور اپنے کمرے سے مطلوبہ طرز کا لباس پہن آیا۔ اس پر استاد صاحب نے میرے آداب اپنانے کو سراہا۔ پھر جب ۱۹۶۹ء میں وطن لوٹنے سے قبل ایک بار کچھ امریکی دوستوں کے ساتھ تھیٹر دیکھنے نکلا، اور انھی پرانے ادب آداب کے موافق کوٹ اور نکٹائی پہنے ہوئے تھا، تو دوستوں نے خوب میرا خاکہ اڑایا کہ میاں یہ فیشن تو اب پرانا ہو چکا اور پس ماندگی بلکہ جمود کا شکار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ تم ابھی تک اسے لیے پھرتے ہو۔ تب میں نے جانا کہ کوٹ فقط پہننے کا ایک گرم خارجی لباس نہیں، بلکہ ایک خاص علامت اور مفہوم کی حامل پوری زبان ہے۔ جس پر میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اوروں کی نہیں، مَیں اپنی زبان بولوں گا۔ ورنہ تو میں ایک نقلچی بندر اور محض دوسروں کی سکھلائی ہوئی بات دہرانے والا طوطا بن کر رہ جاؤں گا۔ لہٰذا اب میں ہر 'آخری فیشن' اور 'نئی بولی' کے پیچھے نہیں چلوں گا، بلکہ ہر بات اپنے کامل ارادے اور سوچ فہم سے اختیار کروں گا، اور بجائے خواہ مخواہ کسی فیشن یا نام نہاد اقدار کے پیچھے چلنے کے، اپنی مرضی کا معقول لباس پہنوں گا، چاہے دوسروں کے فیشن میں وہ جمود اور بے ادبی کی علامت قرار پائے یا عزت و احترام والے نئے ادب آداب کی، (سوائے کسی انتہائی ضرورت کے وقت اور وہ بھی اس تقریب یا ادارے کی ہدایت کے مطابق جہاں مجھے جانا ہو)۔

بچپن سے میں دیکھتا چلا آیا ہوں کہ ہمارے متوسط طبقے والے گھروں کے ماحول میں تناؤ کا بڑا سبب 'چائنا ڈنر سیٹ' رہا ہے، جس کی کوئی نہ کوئی پلیٹ گھر کے کسی فرد، ملازمہ یا مہمان (یا خدا معلوم خود) سے ٹوٹ جاتی۔ یہ سیٹ عام طور پر ایک جیسی چھے یا بارہ پلیٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دعوتوں میں بڑی ترتیب اور اہتمام کے ساتھ گلاس اور یہ پلیٹیں سجا کر رکھی جاتی ہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی

ٹوٹ جائے تو اس حسابی ترتیب میں خلل پیدا ہو جاتا ہے جسے کسی نامعلوم وجہ سے برقرار رکھنے کی ہمیں بچپن سے تلقین کی گئی ہے۔

سو بجائے اس کے کہ ترتیب میں خواہ مخواہ کا خلل پیدا ہو اور ہمارے ذوق کو برا لگے، میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ غیر حسابی ترتیب اپنانے میں کیا حرج ہے؟ اس طرح نام نہاد، جھوٹی عظمت کے بت کی پرستش اور بے وجہ کی پریشانی اٹھانے سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ ورنہ کمال تو ہم حاصل کرنے سے رہے کہ وہ صرف خدائے برتر کے لیے ہے۔ چنانچہ چھے، بارہ یا چوبیس کی ریاضی ترتیب توڑ کر سات، آٹھ یا نو کا عدد اپنانے میں کیا مضائقہ ہے۔ اسی طرح کیا لازم ہے کہ تمام پلیٹیں ایک جیسی ہوں؟ ہر پلیٹ اپنی کسی منفرد شکل کی حامل ہو سکتی ہے۔ خریدنے اور میز پر رکھنے میں بھی سہولت اور ترتیبی عدد ٹوٹنے کا بھی کوئی خدشہ نہیں۔ علاوہ بریں، مختلف طرز کی پلیٹیں اور گلاس ایک طرح کے تنوع اور کثرت کا احساس بھی دلائیں گے، جو انسانی زندگی کا ایک لازمہ ہے، خاص طور پر جبکہ ہم کثرت و تعدد (pluralism) کے دور میں جی رہے ہیں۔ اس میں یہ پہلو بھی نکل سکتا ہے کہ دوست احباب بھی تحفے کے طور پر پورا سیٹ خریدنے کی مشکل میں پڑنے کی بجائے سہولت سے اپنے ذوق کا نمائندہ ایک آدھ کپ یا گلاس خرید کر آپ کی نذر کریں، جو خلوص کا نمائندہ بھی ہو اور آپ کے لیے واقعی ایک خوش کن یاد کا حامل بھی۔ میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ میری یہ تجویز یقیناً قبولِ عام کی سند حاصل نہیں کر سکے گی، اور مجھے اس پر اصرار بھی نہیں۔ ویسے بھی آپ کے ذوق میں تبدیلی کا خواہاں مَیں کون ہوتا ہوں!

ہاں، اگر فرانس کا کوئی 'فیشن ڈیزائنر' فطرت کی طرف لوٹنے کی دعوت دے اور اپنے نئے ڈیزائن کردہ کپڑوں میں (کسی قدرتی طور پر 'فیشنی') طوطے کے پروں جیسے رنگ استعمال کرے تو لوگ اسے اختیار کرنے میں قطعاً کوئی عار محسوس نہیں کریں گے، کہ یہ ایک فیشن ڈیزائنر کا 'حکم' ہے۔ اسی طرح اگر وہ یہ 'حکم لگائے' اور کہے کہ فطرت تقاضا کرتی ہے کہ 'جونیل' کی بناوٹ بدل کر اس میں ارتقائے انسان کی علامت دم بھی لگا دی جائے تو کیا کوئی اس ڈیزائن کو رد کرنے کی جرأت کرے گا؟ نہیں نا! تو پھر مجھے بتائیے کہ میری ایک فطری اور انسانی تجویز کو رد کرنے کی کیا وجہ ہے، جبکہ ایک مغربی یا مغرب کے پیروکار مشرقی ڈیزائنر کی ہر الٹی سیدھی اپج مقبولیت کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے؟!

جب آپ کسی متوسط طبقے کے (مصری) گھر میں داخل ہوتے ہیں، تو آپ کو وہاں ایک کھانے

کا کمرہ نظر آئے گا، ایک خوب سجا ہوا ڈرائنگ روم جو بیٹھنے کے کمرے (سٹنگ روم) سے الگ ہو گا اور ایک سونے کا کمرہ (بیڈ روم)۔ اس کے مقابلے میں روایتی جاپانی گھر اس سے قطعاً مختلف انداز کا حامل ہے۔ وہ (بڑے یا چھوٹے) ایک کمرے پر مشتمل ہو گا، جس میں مقامی جاپانی بنت کا ایک قالین بچھا ہوا ہوتا ہے۔ دن کے وقت یہ بیٹھنے اور کھانے کے کمرے کے طور پر استعمال میں آتا ہے اور رات کو سونے کے کمرے کا روپ دھار لیتا ہے۔ جاپان میں متوسط طبقے کے بیشتر لوگ اب بھی اسی طرز کے مکانوں میں رہائش پذیر ہیں۔ جبکہ ہمارے متوسط طبقے کے لوگ، اپنی اپنی ہمت و توفیق کے لحاظ سے، بڑی حد تک مغربی اندازِ تعمیر اپنا چکے ہیں، اور روایتی انداز کے وہ گھر تقریباً مٹائے جا چکے ہیں جن میں اونچی بیرونی دیواریں، صحن اور کمروں میں خاص طرح کا فرنیچر ہوتا ہے۔ مصر اور کئی دیگر عرب ممالک میں مغربی طرز کے مکان بنانے کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا، جب بڑے بڑے جاگیر داروں اور دربار کے اعلیٰ عہدے داروں پر مشتمل غربیائے ہوئے ارستقراطی طبقے نے مغربی طرزِ بود و ماند اختیار کیا۔ ارستقراطی کلچر کے نمائندوں نے ہمارے ملکوں کو 'یورپ نظیر' بنانے کی خاطر اپنے ثقافتی ورثے کو یکسر ترک کر کے اپنے ماحول اور گھروں کی مغربی طرز پر تعمیر اور تشکیلِ نو کے لیے یورپ سے انجینئر منگوائے۔ اور جیسے کہ ہمارے معاشروں کی روایت ہے، متوسط طبقے کے بیشتر لوگوں نے اس امیر کبیر طبقے کی تقلید کی۔ تاہم ان کے پاس نہ تو اتنے وسائل تھے کہ پوری طرح ان کی پیروی کر سکتے اور نہ وہ مغربی طرزِ تعمیر سے مکمل طور پر واقف تھے۔ چنانچہ ان کے مکان اپنے محدود بجٹ اور کم جگہ کے مطابق ہی نئے طرزِ تعمیر کا ساتھ دے سکے۔ یوں مصر میں اس طرزِ تعمیر نے رواج پایا جسے یورپی لوگ 'لوئی فاروک' طرز کا نام دیتے ہیں، یعنی جو 'لوئی کانز' اور 'لوئی سیز' کے خالص فرانسیسی طرز کا نمائندہ نہیں، بلکہ اس کا چربہ اور ادنیٰ درجے کی تقلید ہے۔

اسی تقلید میں اب ایک مصری گھر کا فرنیچر ٹرک یا وین پر لد کر دمیاط کے کسی مشہور فرنیچر بنانے والے کارخانے سے نہیں آتا، بلکہ یہ سامان یہاں ایک پیچیدہ و مرکب تاریخی عمل سے گزر کر پہنچا ہے۔ یہ فقط گھر میں رکھنے کی چیزیں نہیں، بلکہ ارستقراطی طبقے کے اپنائے ہوئے ایک شعوری تہذیبی رویے کی عکاسی کرتی ہیں، جس کے تحت طرزِ تعمیر اور فرنیچر میں مغربی پیٹرن کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ یہی پیٹرن غیر شعوری طور پر متوسط طبقے میں سرایت کر چکا ہے۔

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی ثقافت کی طرف جھکاؤ کا یہ غیر شعوری رویہ کسی شخص کی حقیقی زندگی اور اس کے طرزِ عمل سے بھی متصادم نظر آتا ہے۔ متوسط طبقے کے ایک گھر میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ مغربی طرز کا یہ سارا فرنیچر اس میں پورے طور پر اپنی اپنی جگہ رکھا جا سکے۔ چنانچہ

گھر کے تمام افراد کے لیے یہ سامان پریشانی کا موجب بنا رہتا ہے۔ خریدنا ضروری ٹھہرا کہ اس کے بغیر ترقی کے اس دور میں پس ماندہ کہلائیں گے، اور پھینکنا یا کسی کو دینا ممکن نہیں کہ اس پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی ہے، جبکہ رکھنے کے لیے جگہ زیادہ چاہیے۔ لہٰذا اسے یہاں وہاں قریب قریب جوڑ کر رکھ دیا جاتا ہے، اور گھر کے افراد بڑی مشکل سے اِدھر اُدھر ہو کر گزرتے ہیں۔ پھر خاتونِ خانہ کے لیے بھی مصیبت کہ کس طرح اسے بچوں بلکہ سب افرادِ خانہ کے شر سے محفوظ رکھے۔ اس سلسلے میں اسے سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اور کبھی گھر کا ماحول بھی مکدر ہو جاتا ہے۔ ڈرائنگ روم عام طور پر بند رہتا ہے۔ وہ کسی اہم مہمان یا ملاقاتی کی آمد پر ہی کھولا جاتا ہے، جو سال بھر میں صرف چند ایک بار ہی زیارت کا شرف بخشتا ہے۔ گویا یہ ڈرائنگ روم اصحابِ خانہ کے لیے ایک سفید ہاتھی ہے جو خواہ مخواہ جگہ بھی گھیرتا ہے اور وسائل کے ضیاع کا باعث بھی بنا رہتا ہے۔ کھانے کا کمرہ البتہ بیٹھنے کے کمرے کے طور پر بھی استعمال میں آ جا تا ہے، اور ڈائننگ ٹیبل سے بھی عام میز کا کام لے لیا جاتا ہے۔ یعنی روایتی پیٹرن یہاں درآمدہ مغربی پیٹرن پر غالب آ گیا۔

اب کھانے بیٹھنے کے کمروں کو چھوڑ کر ہم ذرا کرسی کا جائزہ لیتے ہیں۔ کرسی ایک عام سی چیز ہے جو لکڑی، دھات یا پلاسٹک کی بنی ہوتی ہے، جس کی چار اور بعض اوقات تین ٹانگیں ہوتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ بیٹھنے کے کام آتی ہے۔ کبھی کبھی البتہ اس پر کھڑے ہو کر بلب، ٹیوب لائٹ وغیرہ بھی لگائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر علاقے اور ہر دور میں اس کا وجود (ظنی طور پر) ثابت ہے۔ جب خلیج کے ممالک میں ساٹھ کی دہائی میں، اور بعض دیگر عرب ملکوں میں اس سے قبل یونیورسٹیاں بنائی گئیں تو یہاں باقاعدہ طور پر کرسی کا استعمال دیکھنے میں آیا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ کرسی کی ایجاد ایک خاص ماحول کے اندر عمل میں آئی اور اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ کرسی کے بغیر بھی معقول انداز سے، سہولت و آرام کے ساتھ بیٹھنے اور پڑھنے لکھنے کا کام کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ کرسی کی موجودہ وضع قطع اور بلندی، ریڑھ کی ہڈی کے لیے بھی نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ نیز یہ زیادہ مناسب ہے کہ کرسی زیادہ بلند ہونے کی بجائے نیچی اور زمین کے نسبتاً قریب ہو، جو کم خرچ بھی ہو اور کمر کے لیے بھی آرام دہ، جو عین ممکن ہے کسی ثقافتی پہچان کا حوالہ بھی بن سکے۔ شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یورپی تہذیب میں کرسی کو شروع ہی سے اس لیے اپنایا گیا کہ وہاں کے انتہائی ٹھنڈے ماحول میں بجائے قالین یا بوریا پر بیٹھنے کے یہ انھیں زیادہ مناسب لگی۔ اس کے مقابل مشرقی تہذیب نے ٹھنڈ یا گرمی ہر موسم میں چٹائی کو ترجیح دی اور یہ ہمارے تہذیبی وجود کی شناخت اور ایک خاص علامت کے طور پر سامنے آئی۔ لیکن اب کرسی ہی (شاید 'اقتدار کی کرسی' کے حوالے سے) ہم سب کے ذہنوں

میں ترقی کی علامت بن کر بیٹھ چکی ہے، جیسے اس کے بغیر ترقی کرنا ممکن نہ ہو۔ حالانکہ یہ تنزلی کی بھی ایک علامت رہی ہے۔ انیسویں صدی تک سلاویکی لوگ کرسی پر بیٹھ کر دیوتاؤں کو اپنی جان کی مقدس قربانی پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے مقابل عرب اور چینی زمین پہ بیٹھ کر دنیا پر حکمرانی کرتے رہے، اور داخلی لحاظ سے انتہائی گندھی گتھی، مرکب تہذیبوں میں رہ کر اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ لیکن اس بات سے یقیناً وہ ملازم واقف نہ تھا جس نے ایک عرب ملک کے ائر پورٹ پر 'وی آئی پی ویٹنگ ہال' میں صوفوں کی کمی اور میری تھکاوٹ کے باعث نیچے بچھے صاف دبیز قالین پر ایک طرف بیٹھنے سے مجھے منع کیا، اور بڑے 'اذعان و یقین' سے کہا کہ یہ تہذیبی رویہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں کرسی کا استعمال ترک کرنے کا سبق پڑھا رہا ہوں۔ بلکہ میرا مقصد سوچ فہم کے دریچے کھولنا اور فکر و اجتہاد کا در وا کرتے ہوئے تہذیبی پہچان کی خاطر کوئی معقول متبادل تلاش کرنے کی دعوت دینا ہے۔ کیا ہمارے لیے کوئی چیز دریافت یا ایجاد کر کے تہذیبی تاریخ میں اپنا حصہ ڈالنا ممکن نہیں رہا؟ ہم فقط انتظار کریں کہ کوئی آئے اور بتائے کہ کرسی سے مثال کے طور پر ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کو نقصان پہنچنے کے علاوہ لکڑی کے حصول کے سلسلے میں جنگلات کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یا اگر یہ دھات اور پلاسٹک کی بنی ہے تو بھی اس کا استعمال بالکل یا بحالتِ موجودہ ٹھیک نہیں۔ اس کے بعد ہمیں بتایا گیا کوئی 'حکم' بجا لائیں۔

عرب ممالک میں صحرائی علاقے کے اندر پتھر سے یونیورسٹیاں تعمیر کرنے کے بعد 'ائر کنڈیشنز' لگائے گئے۔ گھر فرانسیسی یا اطالوی طرزِ تعمیر کے مطابق بنائے گئے تو ان کی 'ستر پوشی' کے لیے گردا گرد اونچی دیواریں تعمیر کرنا پڑیں تاکہ شرعی تقاضے بھی پورے ہوسکیں۔ یعنی کھانے کا کمرہ اگر افرادِ خانہ کی بیٹھنے کی ضرورت سے متصادم تھا تو یہاں چاروں اور سے کھلے، پورے گھر کا مسلم 'صارفین' کی 'شرعی ضرورت' سے ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ یہ کہنے کی تو قطعاً ضرورت نہیں کہ اپنے تہذیبی اور مانوس طرزِ حیات سے بالکل مغایر طور طریقے اور طرزِ تعمیر اپنانے سے خود اپنے آپ سے جو اجنبیت کا احساس پیدا ہوتا ہے، اس نے ہماری سہولت و ضرورت اور تجدد پسندی و تقلیدِ مغرب کے درمیان ظاہری تصادم کے علاوہ ہمیں داخلی طور پر بھی منقسم کر دیا ہے۔

یہ گھر اور عمارتیں جو ہم نے تعمیر کی ہیں، بیشتر یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے کسی دکان میں ترتیب سے سجا کر رکھے گئے ڈبے یا قریب قریب استادہ 'ریفریجریٹر' ہوں، جن کے اطراف میں کورنتھی طرز کے آرائشی عمود کھڑے کر کے یا اوپر نقش و نگار بنا کر زیب و زینت کر دی گئی ہے۔ اس میں کچھ مشرقی انداز بھی ہو سکتا ہے، لیکن مشرقی اسلامی خط ان میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ بازاروں،

شاہراہوں تک کے نام اب کمپیوٹر سے لکھے جاتے ہیں۔ اسکولوں میں ہم لوگ خطاطی کی تعلیم بھی حاصل کیا کرتے تھے۔ پھر جب ترقی کے راز ہم پر منکشف ہوئے تو خط والا پیریڈ ختم کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی خطاطی کا فن بھی زوال کا شکار ہو گیا۔ اب جو نسلیں پیدا ہوئیں، وہ اس فن اور اس کی جمالیات سے یکسر نا آشنا ہیں۔ خطاط کا لفظ ایک عار بن کر رہ گیا ہے۔ اب خطاط وہ 'پینٹر' ہے جو کوکا کولا اور فلموں کے اشتہار لکھا کرتا ہے، بلکہ یہ بھی زیادہ تر اب کمپیوٹر میں ہی بنائے جاتے ہیں۔ اس بات کو اپنے ورثے سے ایک طرح کی لاتعلقی کا شاخسانہ یا وقت کی ضرورت کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے، اور یہ ہے بھی، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم نے فن کا وہ نظریہ اپنا لیا جو منجملہ دیگر باتوں کے مغرب سے در آمدہ ہے۔ مغرب میں خط، فنونِ لطیفہ کے ضمن میں نہیں آتا، جبکہ ہمارے ہاں خطاطی، ذوقِ جمال کی آبیاری کا ایک اہم فنی وسیلہ رہا ہے۔ لیکن مغرب میں چونکہ ایسا نہیں ہے، تو اب ہمارے ہاں بھی اس کا مول دو کوڑی کا نہیں رہا۔

ہم میں سے بیشتر کے نزدیک، جو جدید تعلیم یافتہ ہیں، یہ ایک مسلمہ اور ناقابلِ تردید امر ہے کہ ہماری تعلیمی پس ماندگی کا بنیادی سبب اور خرابی کی اصل جڑ، اسباق کے زبانی یاد کرانے میں مضمر ہے۔ بلکہ بعض کے خیال میں اس کے ڈانڈے دینی تعلیم اور حفظِ قرآن سے جا ملتے ہیں۔ میرا بھی یہی نظریہ تھا، لیکن اس وقت مجھے شدید دھچکا لگا جب ۱۹۶۳ء میں امریکا کی کولمبیا یونیورسٹی میں مَیں نے ایم اے انگریزی کے لیے داخلہ لیا، اور وہاں مجھے لازمی نصابی ضرورت کے تحت بعض رومانوی شعراء کی نظمیں زبانی یاد کرنا پڑیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ طالب علم اور پڑھے جانے والے متن کے درمیان گہرا اور حقیقی ربط پیدا کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی وسیلہ نہیں۔ پھر مجھے جاپانی نظامِ تعلیم کے بارے میں پتا چلا کہ اس میں بھی حفظ کو اہمیت حاصل ہے۔ مزید برآں، بہت سے انسانی علوم میں طالب علم کے لیے بنیادی اصول اور ان سے متعلقہ بہت سے اہم پیراگراف اور مقولہ جات زبانی یاد کرنا ضروری ہیں۔ یوں مجھے اپنا 'پہلے والا جدید نظریہ' تبدیل کرنا پڑا، اور یہ احساس ہوا کہ زبانی یاد کرنے کی اہمیت سے انکار درحقیقت اپنے ورثے کا بے سوچے سمجھے، کینہ آمیز رد ہے۔ اپنے تہذیبی ورثے کا ہم اگر احترام اور اعتماد کے ساتھ جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ حفظ کا استعمال، نقد و نظر کا ملکہ بڑھانے میں بڑی معاونت کرتا ہے۔

جدید عربی ادب میں ڈرامے کی تاریخ، المیہ، طربیہ، تاریخی اور دیہاتی پس منظر والے فرانسیسی اور انگریزی ڈراموں اور اس سلسلے میں ارسطو سے لے کر بریخت اور ارٹو تک کے مغربی نظریات کے ترجمے سے شروع ہوتی ہے۔ یوں ڈرامہ ہمارے ہاں مغرب سے آیا اور اسی کے نقطۂ نظر سے دیکھا

گیا، جس میں تماشائی اسٹیج کے سامنے بیٹھتے ہیں جو ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے پر ایک پردے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اداکار اپنی اداکاری سے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی دنیا ہماری دنیا سے براہِ راست یا علامتی طور پر مشابہ ہے۔ بعینہٖ یا کچھ تبدیلی کے ساتھ تراجم کرنے کے بعد، اسی نقطۂ نظر سے ہم نے طبع زاد ڈرامے لکھنے شروع کیے، لیکن خود ہمارے ادبی ثقافتی ورثے میں ڈرامے کی جو مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں وہ ہم سے اوجھل ہی رہیں یا انھیں سامنے لانے کی کوشش نہ کی گئی۔ حالانکہ 'سیرتِ ہلال' کوئی غنائی یا معروف کہانی کی شکل والی لوک داستان نہیں، بلکہ درجۂ اول کی ڈرامائی تشکیل ہے، جس میں ڈرامے کے ساتھ ساتھ قصہ و غناء کا عنصر بھی شامل ہے۔ اسی طرز پر 'صندوق الدنیا'، 'خیال الظل' اور دیگر ڈرامائی کہانیاں اور تشکیلات ہیں۔

اگر ہم جاپانی ڈرامے 'نوہ' اور 'کابوکی' کو دیکھیں تو فنِ ڈرامہ کی ایک یکسر مختلف شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس میں تماشائی اور اداکار ایک دوسرے کے آمنے سامنے نہیں بلکہ ہم آمیز ہوتے ہیں۔ خود ڈرامہ بھی مختلف ادبی اصناف کا ایک خوبصوت امتزاج ہوتا ہے۔ ہم استفادے کی نظر سے جاپانی، قدیم ہندی، چینی اور خود اپنے ادبی ورثے میں ڈرامے کی مختلف شکلوں کا مطالعہ کریں تو ہمارا فنِ ڈرامہ ایک مختلف نہج اختیار کرسکتا ہے اور اس سلسلے میں ہم اپنا ایک فنی نقطۂ نظر تشکیل دے سکتے ہیں، بجائے مغرب کی اندھی تقلید کے جو کافی عرصہ سے ہم کرتے چلے جا رہے ہیں۔)

مغربی تہذیبی پیٹرن کا غلبہ

پچھلی تمام مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ورثے کو ترک کر کے دوسروں کا ورثہ، اس میں پنہاں مفاہیم و اغراض کو جانے بغیر، دل و جان سے اپنا لیا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی اور دوسرے کی تہذیب اور ورثے کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ ہم نے مغربی تہذیبی پیٹرن اور اس کی ثقافتی پیداوار کو بتام و کمال اپنے ایک بالکل مختلف اور اس سے متصادم ماحول میں لا کر اپنانا شروع کیا۔ اس طرح جب اپنی اصل و نہاد سے بیگانہ ہوئے تو ہنس کی چال چلنے والے کوے کی طرح ان جیسے بن پائے نہ اپنی حیثیت برقرار رکھ سکے۔ (کَالْمُنبَتِّ لاَ اَرْضاً قَطَعَ وَلاَ ظَهْراً اَبْقیٰ)۔ پھر آپس میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف تعلیمی اور ثقافتی پسِ منظر نے ہمارے لیے مزید الجھن پیدا کی۔

بیسویں صدی تک آتے آتے مغربی تہذیبی پیٹرن ہمارے بیشتر مفکرین اور عوام کے ایک بڑے حصے کے وجدان و شعور کا مکمل طور پر حصہ بن گیا۔ اب اس میں قطعاً اچنبھے کی بات نہیں کہ یہ ثقافتی

استعمار، مادی و معنوی ہر دو سطح پر ہمارے ہاں کیوں کامیابی حاصل کرتا گیا۔ اس کی پیداواری اور انتظامی صلاحیت، مادی آسائشوں، تفریح فراہم کرنے والے نئے نئے فنون، نیز براہِ راست اور فوری توجیہ و سبب بتانے والے فلسفوں نے ہمارا دل موہ لیا۔ انھی بڑھتی ہوئی کامیابیوں کے باعث، جو مغرب کو اس پیٹرن کے ابتدائی مراحل میں حاصل ہوئیں، مغربی انسان کا اپنی تہذیب و ثقافت پر اعتماد بڑھتا چلا گیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ اس کا تصورِ کائنات انسانی فکر کی معراج ہے؛ ساری انسانی تاریخ جدید مغربی تہذیب کی تاریخ میں ضم ہو کر ہی سعادتِ عظمٰی کے درجے تک پہنچ سکے گی؛ مغربی علوم ہی عالمی علوم ہیں اور ان میں بیان کردہ نظریات حرفِ آخر؛ اور مغرب کا یہی تہذیبی پیٹرن ہر جگہ اور ہر زمانے کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے یا کم از کم اس دور میں تو ایسا ہے۔

مسلم دنیا کو اس تہذیبی پیٹرن کے صورت پذیر ہوتے ہی اس کے ساتھ سخت کشمکش کا سامنا رہا ہے۔ خلافتِ عثمانیہ نے استعمار کے عسکری حملوں کے خلاف 'دار الاسلام' کا مختلف محاذوں پر دفاع کیا۔ اس پر استعماری طاقتیں دولتِ عثمانیہ کے گردا گرد گھیرا ڈالنے لگیں۔ ایک طرف افریقا اور دوسری جانب برِصغیر کو اپنی طالع آزمائی کا ہدف بنایا۔ تاہم عالمِ اسلام کے وسطی ممالک محفوظ رہے، جس کا ایک سبب کچھ مغربی ممالک کا نئی دنیا (امریکا) کی جانب متوجہ ہونا بھی تھا۔ لیکن دولتِ عثمانیہ کے بحران سے دوچار ہوتے ہی مغربی لشکر مشرق کے اسلامی ممالک پر چڑھ دوڑے۔ نپولین کے مصر پر حملے کے ساتھ ہی مغرب نے سلطنتِ عثمانیہ اور بقیہ عالمِ اسلام کے حصے بخرے کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ روس بحرِ اسود کی جانب تُرک عملداری کی ریاستوں پر قابض ہو گیا، انگریز پہلے قبرص اور پھر مصر تک آ پہنچا، اور فرانس نے پھر ممالکِ شام اور عالمِ اسلام کے مغربی حصے کو اپنا ہدف بنایا۔ یوں 'ہوسِ استعمار نے بیشتر مسلم دنیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے'۔

مغرب کی عسکری طاقت، سائنسی دریافتیں، اس کے علمی و عقلی پیٹرن کو اپنانے میں سہولت اور ظاہری دلکشی، وہ بنیادی اسباب تھے جن کی وجہ سے عالمِ اسلام سمیت تیسری دنیا کے سبھی ممالک اپنے تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں میں مغرب کی اندھی تقلید میں مصروف ہو گئے۔

یہ بات سب سے زیادہ آزاد لادینی (سیکولر) سوچ میں نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ یہ خیال کر لیا گیا کہ ہماری 'نشاَۃِ ثانیہ' کا راز مغربی فکر و فلسفہ کی اپنے ہاں 'دیانتدارانہ' منتقلی، اس کے تہذیبی پیٹرن کو اس کی تمامتر 'خوبیوں خامیوں سمیت' اپنانے اور مسلم معاشروں کے اجتماعی اور انفرادی طرزِ فکر و عمل کی اس پیٹرن کے مطابق تشکیلِ نو میں مضمر ہے۔ مصر میں اس میلان کی نمائندگی نسلِ نشاَۃِ ثانیہ (جیل

النہضہ) نے کی، جو احمد لطفی، شبلی شمیل، سلامہ موسیٰ وغیرھم پر مشتمل تھی۔ ان میں کچھ تو یکسر غربیائے ہوئے، انتہا پسند اور اپنی تہذیبی شناخت سے بیگانہ تھے، جنھوں نے بالکل مضحکہ خیز طور اطوار اپنانے پر ابھارا، جیسے ہیٹ پہننا اور معیاری عربی ترک کر کے مقامی لہجہ اپنانا اور اسے عربی اسلامی رسم الخط کی بجائے بائیں سے دائیں لاطینی حروف میں لکھنا۔ (ترکی اور انڈونیشیا ملائشیا وغیرہ میں بھی دائیں سے بائیں لکھے جانے والے رسم الخط اسی استعماری نقطۂ نظر کے تحت ترک کیے گئے)۔ تاہم کچھ نسبتاً معقول تھے اور بچگانہ نوعیت کی تجاویز پیش کرنے سے گریزاں رہے۔ لیکن معتدل ہوں یا انتہا پسند، لبرل ذہن کے لوگوں والی اس نسل نے اپنے معاشرے کو یکسر غربیا دینے اور تعمیر و ترقی میں مغرب کی کامل پیروی کرنے پر زور دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ اور اشتراکی (المعروف 'سرخ انقلابی') تحریک بھی سرگرمِ عمل تھی۔ اگرچہ ان 'بائیں بازو' والوں کا موقف، سرمایہ داری اور مغرب کی سیاسی و اقتصادی آزادی پر تنقید کا حامل رہا ہے، لیکن یہ لوگ مغرب کے ثقافتی اور علمی ظواہر کے پیچھے کارفرما فکری و تہذیبی پیٹرن کو بنیادی طور پر مانتے اور اسی سے استمداد کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں مغربی تہذیب پر تنقید اس کی سیاست اور معیشت کے صرف انتظامی پہلوؤں تک محدود رہی۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں مغرب کا یہ تہذیبی پیٹرن عرب ممالک میں کسی حد تک پسِ منظر میں چلا گیا اور 'اخوان المسلمون' جیسی اسلامی تحریکیں اور 'مصرِ برنا' (مصر الفتاۃ) طرز کی قومیتی نظریے کی حامل اشتراکی جماعتیں وجود میں آئیں۔ اس طرح ایک طرف عرب قومیت اور دوسری جانب فکر وفہم میں اسلامی انداز اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ 'دائیں اور بائیں بازو' کی ان تحریکوں نے مغرب کے تہذیبی پیٹرن سے انحراف کرتے ہوئے اپنے ورثے اور تشخص کو ابھارنے اور اپنانے کی دعوت دی۔

یقیناً یہ ساری کوششیں اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں کہ انھوں نے مغرب کے تہذیبی پیٹرن کو چھوڑ کر اپنی تہذیب و ثقافت کو زندہ کرنے کی جانب قدم بڑھایا۔ لیکن اپنے اصل اغراض و مقاصد میں یہ جماعتیں بھی 'مغرب کی ترقی جیسی ترقی' کے حصول اور زمانے کا ساتھ دینے کو اپنی پہچان مغرب کی شناخت کے مطابق تشکیل دینے کی خاطر کوشاں رہیں۔ گویا اپنے معاشروں کی تشکیلِ نو میں کسی نہ کسی صورت مغربی پیٹرن ہی کو بطور شناختی وسیلے کے استعمال کیا گیا، گو اس کی ظاہری شکل مشرقی تھی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ موقف اختیار کرنے کے بعد اپنے تہذیبی ورثے کی دریافت

اور اس کی ترتیبِ نو مغربی نقطۂ نظر کے تحت کی جانے لگی۔ چنانچہ ہمیں پتا چلا کہ معتزلہ 'عقلیین' ہیں؛ عبد القاہر جرجانی 'اسلوبیاتی' طرزِ فکر کا حامل بلاغت دان ہے؛ اسلامی آرٹ 'تجریدی' ہے؛ 'خوارج اور صعالیک' کی شاعری میں 'غربت و اجنبیت' کا احساس پایا جاتا ہے؛ ابو العلاء معری فلسفے میں ڈیکارٹ سے پہلے اس کے 'تشکیکی نقطۂ نظر' کا حامل ہے، بلکہ تشکیک کا سہرا شاید امام غزالی کے سر سجتا ہے؛ اور اسلامی میراث کا دفاع کرنے والے ایک عرب مارکسی پروفیسر کے بقول مادی جدلیت کے اسی فی صد قوانین ابنِ خلدون نے دریافت کیے۔ یوں ان محترم پروفیسر کے نزدیک، ابنِ خلدون ، مارکس سے پہلے مارکسی تھا، اور مسلم فکر و فلسفہ کی رو سے نہیں بلکہ اس بیس فی صد کم مارکسیت کے ساتھ جو خود مارکس میں جا کر پوری ہوئی، ابنِ خلدون کے فلسفے کا کوئی جواز نکلتا ہے۔ یعنی اپنے تہذیبی ورثے کی اہمیت بجائے اس کے اندر پنہاں ہونے کے، مغربی تہذیبی پیٹرن سے اس کی قربت و دوری سے متعین ہوتی ہے۔

حیرت و افسوس کی بات ہے کہ مغرب کے تتبع کا یہ فلسفہ 'خالص اسلامی نقطۂ نظر' کی حامل بعض 'سطحی تحریکوں میں بڑی گہری جڑیں' پکڑے ہوئے ہے۔ کئی مسلم مفکرین نے مغربی تہذیبی پیٹرن کے بیشتر پہلوؤں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہے، اور اسے ایک نمونے اور حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک 'اسلامی نشأۃِ ثانیہ کا منصوبہ' اسی پیٹرن پر عمل پیرا ہونے سے نہایت 'آسانی اور حسن و خوبی' کے ساتھ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بعض کا خیال ہے کہ مغرب کے تہذیبی پیٹرن میں صوم و صلوٰۃ، مرد و زن کے باہم اکٹھا ہونے کی ممانعت اور پردے کی پابندی جیسی 'اسلامی شقوں' کی شمولیت اور کچھ دیگر 'صنائع بدائع' سے تحسین و آرائش کر لی جائے، تو یہ کام مغرب کے بلند پایہ فکر و فلسفہ کی بہترین اسلامی تطبیق ہوگا۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مغرب کے حوالے سے ہم مذہب کو دریافت کرتے ہیں۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دین سائنسی انکشافات سے پہلے سائنسی نظریات کا حامل ہے۔ دین اور سائنس میں کوئی تصادم نہیں۔ تمام تر سائنسی قوانین قرآن میں موجود ہیں۔ ('...لاَ رَطْبٍ وَّلاَ یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ' کا جیسے یہی مطلب ہے اور قرآن سیاسی، عسکری، انتظامی، قانونی اور معاشی و معاشرتی اصلاح، نیز 'تدبر و تفکر پر مبنی تازہ کاری' کی دعوت نہیں دیتا، بلکہ یہ قدیم و جدید سائنس کی کتاب ہے(۱۳))۔ اسی طرح یہ ثابت کرنے پر پورا زور صرف کر دیا جاتا ہے کہ عورت کے حقوق اور جدید انتظامی امور کو سب سے پہلے اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ گویا خود اسلام کی قانونی حیثیت اور 'شرعی جواز'، مغربی تہذیبی پیٹرن سے اس کے قرب و بعد میں تلاش کیا گیا۔ اس طرح نظریاتی یا عملی طور پر اسلامی تہذیبی پیٹرن کو اپنانا، اس کی مغربی پیٹرن کے

مطابق کایا کلپ کیے بغیر ممکن نہ رہا۔

اپنے نہاں اغراض و مقاصد اور عیاں افکار و اعمال میں تنوع، اختلاف اور تصادم کے با وصف مسلم نشاۃِ ثانیہ کے ان تمام منصوبوں میں مغرب کو اولین مصدر و مرجع اور آخری سند قرار دیا گیا۔ یعنی مغرب وہ گھوڑا ہے جو ترقی کی دوڑ میں ہم سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اسے جا لینا، ظاہر ہے، اس کے نقشِ پا کھوجے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ 'اسلامی نقطۂ نظر' سے تو ہم نے اس پر سبقت حاصل کر رکھی ہے۔ اب فقط اسے پکڑنا اور لا کر اپنے اصطبل میں باندھنا ہے، جس کے لیے تحریکوں کا یہ سارا بکھیڑا اور جماعتوں کے یہ سب جال ہم نے پھیلا رکھے ہیں۔ مغرب نے ہمارا 'نقطۂ نظر' چھین کر اپنے میں شامل کر لیا ہے۔ یوں اس کا نقطۂ نظر 'عالمی نقطۂ نظر' بن چکا ہے، جس کا تتبع لازم ہے۔ مغرب کی تہذیبی تشکیل اپنی جغرافیائی اور زمانی حدود و قیود سے ما ورا ہو کر عصرِ حاضر کی جدید عالمی بلکہ 'کائناتی' فکر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہی بات پیرویِ مغرب کو سندِ جواز عطا کرتی ہے۔ اب نقطۂ نظر اور مطمحِ نظر ایک ہی ہے۔ اب انسان کے سارے خوابوں کی تعبیر اور جسم و روح کے تمام مسائل و تکالیف کا حل، فکر و عمل کے اسی کعبے کا طواف کرنے اور اسی کا ملتزم تھام کر گڑگڑانے سے ملے ہو گا۔ مغربی علوم و نظریات حرفِ آخر ہیں، جن کی تحصیل ہر 'مشرقی سعادت مند اور شقاوت نصیب کی تہذیب و تادیب' کے لیے ضروری ہے، ورنہ کسی قسم کی ترقی ممکن ہے نہ تجدید۔

یہ فکری دیوالیہ پن، مغربی فکر و ثقافت کی طرف ہمارے نام نہاد تہذیب یافتہ طبقے کے مسلسل جھکاؤ اور اپنے تہذیبی ورثہ سے بیگانگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ نتیجتاً ہمارے معاشرے تو 'مغرب نظیر' نہ بن سکے، البتہ 'وارثِ باغِ ارم' قدیم و جدید کی کشمکش میں ضرور جہنم رسید ہوتا رہا اور چمنستان جھاڑ جھنکار سے اٹ گیا۔

بے دلی زوروں پہ تھی، گلشن بھی ویرانہ رہا
ہم بھی بیگانے رہے، سبزہ بھی بیگانہ رہا (۱۴)

اپنے ورثے سے بیگانگی ایک طرف، ہم عالمی تہذیب سے بھی محض انجان رہے۔ ہم میں سے کون ہے جس نے جاپان اور چین کو اپنے درسی مطالعے ہی کا موضوع بنایا ہو؟ کون ہے جس نے سواحلی زبان سیکھ کر افریقہ کے مشرق میں بسنے والے ان باشندوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہو جن کی یہ زبان اسلام اور 'عروبہ' سے ان کے قریبی تعلق پر دلالت کرتی ہے؟ ہم فقط اس 'عالمی تہذیبی ورثے' کے دل دادہ و شائق رہے جو صرف مغرب کی پیداوار ہے۔ یہ سوچنے اور جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس میں کس نوعیت کے فکری مفاہیم پوشیدہ ہیں اور اس کی جڑیں کونسی تاریخی

اور معاشرتی مٹی سے اپنا رزق کشید کرتی ہیں۔ ان کے اوپر نظر آنے والی طرزِ جدید کی ترشی ترشائی لچکیلی شاخوں کی لپکتی ہمکتی بانہیں اور ان میں کھلے جاذبِ نظر پھولوں کے مکھڑے کیونکر اور کس لیے نمودار ہوئے، کہ در حقیقت جو پیچھے چھپے کانٹوں نے 'بطور پھندا' پھیلا رکھے ہیں۔ بجائے اس کے ہماری تمام تر توجہ اور جد و جہد ان عالمی معلومات حاصل کرنے میں صرف ہوئی جو دراصل مغربی ہیں، عالمی نہیں۔ پھر ان معلومات کی اپنی کتابوں اور مطالعوں میں مغربی نقطۂ نظر سے ترتیبِ نو کی گئی۔ یہ معلومات مغرب کے لیے تو مفید ہوسکتی ہیں، مگر ہمارے معاشروں کی تہذیبی لغت میں ان میں سے بیشتر کا اندراج کسی مفہوم کا حامل نہیں۔

'تہذیب یافتہ' طبقے کے ساتھ ساتھ، یا شاید اس کے مقابلے میں، عالمِ اسلام کے اندر ایک 'تعلیم یافتہ' طبقہ بھی پایا جاتا ہے۔ وہ طبقہ اگر مراعات یافتہ ہے تو یہ ایک طرح سے حقوق یافتہ یا کم از کم حقوق شناس کہلاتا ہے، لیکن فکری سطح پر ان میں انیس بیس ہی کا فرق ہوتا ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے مناصب پر بھی فائز ہوتے ہیں اور عام نوعیت کے حکومتی و غیر حکومتی عہدے اور ملازمتیں بھی ان کے رزق و نفوذ کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان میں یونیورسٹیوں یا دیگر نچلی سطح کے تعلیمی اداروں کے اساتذہ، صحافی، مترجمین اور ریڈیو، ٹیلی وژن کے مستقل یا جز وقتی 'دانشوران' شامل ہیں۔ یہ لوگ مغربی تہذیبی پیٹرن سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں، مگر اس کے پوشیدہ مفاہیم اور خوبیوں، خامیوں سے یا تو محض نا واقف ہوتے ہیں یا تجاہلِ عارفانہ برتتے ہوئے اسے ایک متأثر کن، 'عالی نسب افکار' کے ہر دم تازہ و دلکش پھولوں کا ایسا خوبصورت گلدستہ خیال کرتے ہیں جسے خواہ مخواہ کسی مقامی تہذیب یا نظام کی ڈوری میں لپیٹ کر مخصوص طرزِ حیات کی چھاپ نہیں لگائی گئی۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ افکار 'عالمگیر انسانی سوچ' کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ 'تعلیم یافتہ' لوگ مغرب کے ایک طرح سے آلۂ کار ہوتے ہیں اور اس کے تہذیبی پیٹرن سے نکلی اقدار کا گہری نظر سے جائزہ لینے سے قاصر، لیکن بہت اچھے ناقل اور ترویج کار ہونے کا کبھی شعوری اور بیشتر غیر شعوری طور پر فریضہ انجام دیتے ہیں۔ 'ولائے مغرب کی مے میں غرق' لوگوں کا یہ گروہ استیعابِ فکر کا نہایت عمدہ ملکہ رکھنے کا مدعی ہوتا ہے، اور عام طور پر تحصیلِ علم اور حصولِ اسناد کا شوق رکھنے کے علاوہ اپنے علم و مطالعہ کو تبصرہ و تنقید اور مباحثہ و مذاکرہ کے ذریعے عام کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ مگر تنقیدی بصیرت اور مغربی نظامہائے فکر و عمل کے جامع ادراک سے بڑی حد تک محروم ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، خاص طور پر جبکہ تنقیدی ملکہ اور مستقل رائے کا حامل ہونے کے لیے اپنی اور دوسرے کی ذات سے گہری واقفیت، اپنے علٰیحدہ فکری نظام کی اصالت کا کامل یقین، اپنی صلاحیت کا ادراک اور خود پر پختہ اعتماد کی ضرورت ہوتی

ہے۔ یہ بات سہل انگاروں کے لیے ممکن نہیں۔

کتنا آسان ہے تائید کی خو کر لینا
کتنا دشوار ہے اپنی کوئی رائے رکھنا (۱۵)

یہ تعلیم یافتہ اور 'عالمی فکر کے بادۂ عرفان سے سرمست' لوگوں کا قبیلہ ہماری تعلیم و ثقافت کے میدان میں سب سے خطر ناک طبقہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ گروہ ہمارے فکری اور معاشرتی نظاموں کو غربیانے کے عمل اور مغربی پیٹرن کو تمام تر جانبداریوں سمیت قبول کرتے ہوئے اپنا نظامِ اقدار اس کے مطابق تشکیل دینے کا دل و جان سے متمنی ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ انھیں (اور ان کے توسط سے ہمیں) بتاتا ہے کہ مغرب کی 'نشاۃِ ثانیہ' کی ابتدا نئے فنون و آداب کی تشکیل اور انسان کو کائنات کا مرکز قرار دینے سے ہوتی ہے۔ میکیاولی اور ہوبز کے دور سے نہیں ہوتی، نہ مغربی استعمار کے آغاز اور لاکھوں انسانوں کے منظّم قتلِ عام سے۔ ان کے ہاں انقلابِ فرانس آزادی، اخوت و مساوات اور انسانی حقوق کا علمبردار انقلاب تھا۔ سیکولر انداز کا حامل وہ پہلا انقلاب نہ تھا جس میں انسان نے عقلِ محض کی پوجا کی اور تشدد و دہشت گردی کا سہارا لے کر بے گنہ نسلوں کو اس کی بھینٹ چڑھایا۔ اپنا عرشِ حکومت صدیوں کی ساختہ پرداختہ جیسی تیسی تہذیبی یا دینی و اخلاقی اقدار کے لاشوں پر سجایا، اور پھر مشرق کی جانب متوجہ ہو کر مسلم ممالک کو روندا۔ ہمارا یہ تعلیم یافتہ طبقہ مغربی طرز کی ترقی کو انسانی تاریخ کا معجزہ قرار دیتا ہے اور یہ نظر انداز کر دیتا ہے کہ مادی منافع سے کہیں زیادہ اس کے معنوی خسارہ جات نکلتے ہیں۔ اسی طرح نطشے کو دنیا کے سب سے بڑے فلسفی کے طور پر پیش کیا گیا۔ خدا کے اور اس کے بعد فطرت سے انسان کے علیحدہ اور مستقل وجود کو ختم کر دینے والے لااُبالی فکر سنج کے طور پر نہیں۔ 'ساختیات' اور 'ردِّ تشکیل' کو ادبی تنقید کے بالغ نظر مکتبہ ہائے فکر گردانا گیا۔ ایسے مکاتبِ نقد و نظر نہیں جو انسان مخالف نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔

یہ لوگ مغرب کے کسی ملک سے تعلیم حاصل کریں یا اپنے ہی ملک میں، لیکن جہاں بھی ہوں مغربی پیٹرن سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ جو کچھ وہاں کی کتابوں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں، اسے دیانتدارانہ انداز سے بتمام و کمال، لیکن بغیر تنقیدی نظر ڈالے اپنی زبان میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں یہ لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ مغربی علوم کو اہلِ مغرب کی طرح انھی کے نقطۂ نظر سے پڑھاتے ہیں۔ اپنے اپنے مضامین میں موضوعات اور تدریسی نصاب، 'عالمی' یعنی مغربی نصاب ہائے تدریس اور موضوعات کو دیکھے اور ان سے استمداد کیے بغیر ترتیب نہیں دے سکتے۔

حوالہ جات

(۱) (حبیب الرحمٰن)

(۲) علامہ اقبال کے ایک ہم نشین ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا یہ مصرع مترجم کے ذہن میں تھا جو ایک ادبی اصطلاح 'تداخلِ حواس' کی مثال ہے:

نگاہِ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں

(۳) یہ موضوع امریکی فلسفی اور سیاسی معیشت دان فرانسس فوکویاما کی سرد جنگ کے خاتمے کے بعد والی صورتِ حال کے سیاسی تجزیے اور اس سلسلے میں تاریخی پیش گوئی کے طور پر تصنیف کردہ کتاب The End of History and the Last Man میں پیش کیے گئے تصورِ تاریخ سے مشابہ یا متوازی معلوم ہوتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ یہ فوکویاما کا اپنایا ہوا تصورِ تاریخ ہے، جبکہ مسیری نے یہ تصور مغرب کے تہذیبی =

(۴) جیسے انوری نے کہا: در جہانی و از جہاں بیشی ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

(۵) خشک مغز و خشک تار و خشک پوست از کجا می آید ایں آوازِ دوست (رومی)

(۶) شاید یہی وجہ ہے کہ 'علم' اور 'شعر' کو روایتی طور پر ایک دوسرے کا متضاد اور حریف گردانا جاتا ہے۔ بقولِ غنی کاشمیری:

ز شعرِ من شدہ پوشیدہ فضل و دانشِ من
چو میوہ ای کہ بماند بزیرِ برگِ نہال

(۷) قرآن کا ارشاد ہے: ﴿**ولو شاء ربک لجعل الناس اُمة واحدة، ولا یزالون مختلفین**﴾ [ہود:۱۱۸]۔ یہی بنیادی مضمون سیاق کے کچھ اختلاف کے ساتھ سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۳، اور سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۸ میں بھی وارد ہوا ہے۔ نیز مسلم قانون و فلسفہ کی رو سے 'دنیا و آخرت' میں سزا و جزا اور 'مکافاتِ عمل' کو 'کسب' یعنی انسان کے اختیاری فعل پر مبنی قرار دیا گیا ہے، کہ بنیادی طور پر انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی اور 'حقِ تحیُّز' حاصل ہے۔ اگر یہ حق اور آزادی سلب ہو جائے یا سلب کر لی جائے تو ایسی صورت میں انسان کو اس کے غیراختیاری، اضطراری افعال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ [مترجم]

(۸) سابقہ حاشیے کی محولہ آیات دیکھیے۔

(۹) ﴿**یآیھا الناس اِنَّا خلقنکم من ذکر واُنثیٰ، وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا، اِنَّ اکرمکم عند الله اَتقکم، اِنَّ الله علیم خبیر**﴾ [الحجرات: ۱۳]

(۱۰) سابقہ حاشیے میں مندرج آیت دیکھیے۔ نیز پیغمبرؐ کا قول ہے: **لا فضل لعربي علی عجمي اِلا بالتقوی**.

(۱۱) پیرایہ احمد ندیم قاسمی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

جب بھی آئیں مرے ہاتھوں میں رُتوں کی باگیں
برف کو دھوپ تو صحرا کو گھٹا دے دوں گا

(۱۲) رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایران کے ایک انقلاب انگیز شاعر محمد رضا عشقی کے الفاظ میں:

ہر آنچہ می کنی بکن اے دشمنِ قوی
من نیز اگر قوی شدم از تو بتر کنم

(۱۳) اس سلسلے میں پیغمبرؐ کی زندگی سے یہ واقعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آپؐ نے ایک بار ویسے ہی کہہ دیا کہ کھجور کے درخت کو 'گابھا' نہ دیا جائے تو کیا ہو۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا، تو فصل بار آور نہیں ہوئی۔ اس پر پیغمبرؐ نے کہا کہ (میں یہاں قرآن کی تعبیر و تطبیق نہیں کر رہا تھا کہ جس کی پیروی لازم ہو، ان معاملات میں میری رائے پر نہ چلو،) یہ دنیاوی امور تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ پیغمبرؐ کے الفاظ ہیں: (**انتم اَعلم باُمور دنیاکم**)۔ بعض لوگوں نے قرآن کی سائنسی انداز پر تفسیر و تشریح کی کوشش کی ہے، جیسے یمن کے عبد المجید زندانی اور مصر کے شیخ طنطاوی، لیکن یہ ان کی ذاتی اپج کا نتیجہ ہے۔ ورنہ پہلے زمین کے ساکن ہونے کا نظریہ قرآن سے 'استخراج' کیا جاتا تھا، پھر اس کا متحرک ہونا بھی قرآنی آیات سے ثابت کیا جانے لگا۔ اسی طرح دیگر سائنسی انکشافات و قوانین، نیز اپنی آراء اور نظریات کو قرآن سے تطبیق دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی طرزِ فکر تھا جس پر اقبال نے طنزاً کہا:

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر......[مترجم]

(۱۴) (خورشید رضوی)

(۱۵) (انور مسعود)